

اَللّٰهُمَّ جَبِّيلٌ وَمُحِبُّ الْجَمَالِ

سپارے اندر پرائے دوست

پروردگار محمد الغزیز بلوچ
کی نذر!

واللہ!

۴/۲۰

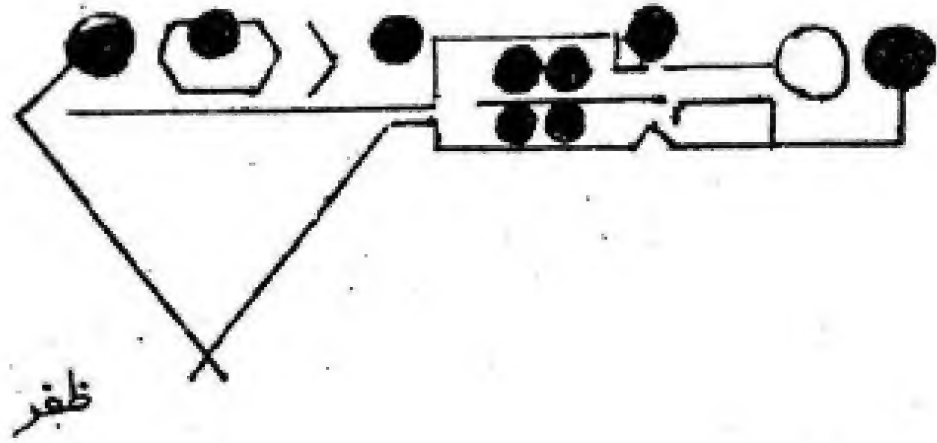
(خاکے)

از

عبد الغزیز بلوچ

ایم۔ اے

(جملہ حقوق بحق فاروق عزیز سلا محفوظ ہیں)



ظفر

حبیب الرحمن بٹالوی

ایم۔ اے (ایجو)

ایم۔ اے (فارسی)

ایم۔ اے (اسلامیات)

نئی پریس لاہور

شیر محمد کاتب ملتان

اپریل ۱۹۷۵ء

چار روپے

ناشر

طباعت

کتابت

بار اول

قیمت

منے کا پتہ

مرکز ادب حسین آغا ہی ملتان

تہن تر تیب

دالف، عزیزان محترم

(ب) بزرگان محترم

۷۵	ڈاکٹر مسید عبداللہ	۱۹	۴	۱	انتساب
۸۱	علامہ غلام شبیر بخاری	۲۰	۵	۲	جرعہ اولین
۸۷	پروفیسر میاں سعید اختر مرحوم	۲۱	۸	۳	تعارف
۹۵	سید شمس الحسن جعفری	۲۲	۱۵	۴	نماز
۱۰۱	میاں نعیم الکریم	۲۳	۱۹	۵	راؤ آفتاب احمد خاں
۱۰۵	فشی ہرگوپال تفتہ شانی	۲۴	۲۳	۶	عالمگیر مرحوم
۱۰۷	قاضی جان احمد شجاع آبادی	۲۵	۲۷	۷	محمد اخیل
۱۱۱	سید مظفر علی شمس	۲۶	۳۱	۸	نواب زادہ مجید اختر خاں
۱۱۹	نواب زادہ نصر اللہ خاں	۲۷	۳۳	۹	ملک محمد نواز
۱۲۷	مولانا تاج محمد لاٹکپوری	۲۸	۳۷	۱۰	انصاری صاحب
۱۳۲	مولانا کوثر نیازی	۲۹	۴۱	۱۱	مولانا فیضی ایم۔ اے
۱۳۹	شورش شمس ہاشمیری	۳۰	۴۱	۱۲	مظفر الدین احمد
۱۴۹	دل کی بات	۳۱	۴۵	۱۳	شیخ الدین قریشی
			۵۱	۱۴	بیک بیوٹی
			۵۳	۱۵	ظفر صاحب
			۵۹	۱۶	ذکر لغاری
			۶۱	۱۷	ارشاد شانی
			۶۸	۱۸	پروفیسر وقسی کرنالی

انتساب

مروجرى، تیخ اھیل، شہبازِ خطابت، کلیمِ وقت
ظفر علی شانی اور اقبال کے شاہین

آخا شورش کا شمیری

کے نام معنون کرتا ہوں۔ جن کا وجود میری نگاہ میں، علم و ادب
اور محافت و خطابت کا چشمہ صافی ہے جس سے پیاسی روئیں
بقدر استطاعت / استعداد سیراب ہو رہی ہیں۔

بگیر این ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

جرعہ افین

گلستانِ اردو ادب میں قلمی خاکہ (Pen Sketch) مختصر افسانہ کی طرح ایک کم عمر پودا ہے۔ حالی کی حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگار غالب شبلی کی المامون، الغزالی اور الفاروق، نذیر احمد کی توبۃ النصوح اور ابنِ الوقت، مرزا فرحت اللہ بیگ کی مختصر سوانح عمری بعنوان نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی کچھ میری زبان کی قلمی خاکہ کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ قلمی خاکہ لے ایک دم یہ مقام حاصل نہیں کیا جس مقام پر آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں بلکہ اسے بھی داستان سے افسانے تک کے مراحل طے کرنا پڑے۔ یہ الفاظ دیگر جس طرح ہماری قدیم داستانوں کی کوکھ سے ناولوں نے جنم لیا پھر ناولوں سے ناولٹ، ناولٹ سے افسانہ اور افسانہ سے مختصر افسانہ وجود میں آیا۔ بالکل اسی طرح سوانح عمریوں، ناولوں اور افسانوں میں ابتداء ہی سے ایک چیز نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی گئی۔ جس کا نام کردار نگاری ہے۔ یہ کردار مزاحیہ بھی ہیں، بخیرہ بھی، پراسرار بھی ہیں اور سیدھے سادے بھی۔ بعض کو پڑھ کر ہمیں ان پر پیار آتا ہے اور بعض سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بعض زندہ جاوید ہیں اور بعض کتابوں میں دفن ہو چکے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے پیش کردار کرم، مرزا ظاہر وار بیگ، ماما عظمت

ابن الوقت۔ میر امن کا کردار، خواجہ سگ پرست (باغ و بہار) مرزا ہادی بکوا
کے کردار، گوہر مرزا اور سیم آند جان (امراؤ جان آدا) اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی
سجاد حسین کا کردار، حاجی بخلول (حاجی بخلول)۔

رقن ناتھ سرشار کے کردار، میاں خوجی (فسانہ آزاد)، منشی مہاراج بلی (سیر
کہار)، پریم چند کے گھیسو اور مادھو (کفن)، کرشن چندر کے اکثر و بیشتر مجھے فرشتے
فن افسانہ نگاری کے آدم نمٹو کا شنکر (کالی شلوار)، جتی (جتی)، اور گوپی ناتھ
(افسانہ گوپی ناتھ کا پراسرار کردار)، ایم اسلم کا لاجواب آلو اور منشی جی اقبال علی
تاج کا چچا چکن شوکت تھاری کا قاضی جی وغیرہ اردو ادب کے چیدہ چیدہ
زندہ جاوید کردار ہیں۔

لیکن یہ کردار کسی نہ کسی سوانح نامہ اور افسانے کا حصہ ہیں۔ جن میں
ان کرداروں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ کردار کو علیحدہ خاکہ کی صورت
دینے میں خواجہ حسن نظامی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اپنے بولچل
قلم سے اس میں حسین پیوند کاری کی۔ انہوں نے اشخاص کے ہی نہیں بلکہ
اشیاء کے بھی خاکے لکھے (لالین۔ گلاب کا پھول، چھپر، جھینگر، اور آلو وغیرہ)۔
بابائے اردو مولوی عبدالحق نے چند ہم عصر لکھ کر اس صنف ادب کا باقاعدہ
اختراع کیا۔ ان کے نام دیو بائی کو بقائے دوام کے دربارے دستاویزات
مل چکی ہے۔ بابائے اردو کے پیش کردہ اکثر کردار ہمارے عام کردار ہیں۔ پروفیسر
رشید احمد صدیقی نے خواص پر قلم اٹھایا نتیجہ نگجائے گرانمایہ اور ہم نفسانِ وقت
وجود میں آئیں جن میں کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مزے

کی بات یہ ہے کہ رشید صدیقی صاحب زبان کے پتھار سے میں قادی کو اتنا
مہوش کر دیتے ہیں کہ اسے مقامی / غیر مقامی کا احساس تک نہیں ہوتا اور
وہ خالص علی گڑھ کی شخصیتوں کو بھی مشابہت سمجھ کر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اکی کا خاکہ
ایوب عباسی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بھلا دلی والے یہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے کہ زبان کے اعتبار سے
علی گڑھ ان سے بازی لے جائے چنانچہ اشرف مہجوری دہلوی کا ناریل چٹا اور
دلی کی چند عجیب ہستیاں ہمارے سامنے ہنستی بولتی آن کھڑی ہوئیں۔ بابائے
اردو کئے نام دیو مال کی طرح کے معمولی، بظاہر آن پڑھ لوگ، گراپنے فن کے
بادشاہ۔ میر باقر علی داستان گو گھمکی کباتی، گننے نہا رہی والے اور ملن ناتنی وغیرہ
کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے۔ برتے تو عمر بھر کا غلام بن جائے۔ بظاہر عام لوگ
باگ دیگ کی کھرن، دلی کے بدڑے۔ بہا ملن دمن کے پکتے، وضع داری
پر جان مینے والے قابل پریش انسان۔

سند باد جہازی، مولانا چرخ حسن حسرت کا شمیری ہلے بقول حسین حالی
مردم دیدہ میں اپنے جادو بیاں قلم سے مزاج کے ساتھ ساتھ زندہ انسان پیش
کئے۔ دوزخی، مرزا عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ، لکھ کر عصمت چغتائی نے اس
صنف ادب کو اس فنکارانہ جا بکدستی سے استعمال کیا کہ یہ چیز افسانے سے
قریب آکر افسانے سے زیادہ دلچسپ بن گئی اور دیکھتی ہے انھیں گلستانِ اردو
ادب کا یہ کم عمر پودا سب کی آنکھ کی تازگی کا تارا ہو گیا۔ بے شمار مشتاقان
دید آغوش محبت دے گئے، اس کی طرح پلکے، کئی راستے میں کھیت رہے

کئی اسے اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان بامراد لوگوں میں شیش محل کے شیش ساز شوکت تھا، لوی، دید و شنید کے جہاں دیدہ رئیس احمد جعفری، یاران کمن کے یار غار عبد المجید ساکت، عظمت رفتہ کے فردوس رفتہ ضیاء برنی اور کجمنہ گوہر کے کانگن شاہد احمد ہلوی سرفہرست ہیں۔ چہرے اور نورتن کے خالق آغا خورشید شمس کا شمیری کو بھی ادب کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سوریزان محترم کبھی اشاعت پذیر نہ ہوتی۔ کیونکہ اس میں مصنف کی طرح رہا سوائے راؤ آفتاب احمد غاں، کے گمنام لوگ ہیں۔ اس کی اشاعت کا خیال پہلے پہل جنوری ۱۹۷۱ء میں لیکچرر رشپ کا انٹرویو دیتے وقت آیا۔ انٹرویو مکیش کے چیئرمین پروفیسر وارثی صاحب نے پوچھا

What is your contribution towards urdu adab:
any printed ghazal or short story?

میں نے انہیں جواب دیا کہ یہ ضروری نہیں اردو ادب کا ہر طالب علم شاعر یا افسانہ نویس ہو۔ میری یہ دیا انتدارانہ رائے ہے کہ آئندہ پچاس سال تک کوئی شخص قصاعوی یا افسانہ نویسی کے پھٹے میں اپنی ٹانگ نہ اڑائے تو یہ اردو ادب پر احسان ہو گا۔ پروفیسر صاحب مسکرائے، فرمانے لگے۔ کالج لائف میں آپ نے کوئی چیز لکھی۔ ادب کے طالب علم کا کوئی نہ کوئی مشغلہ تو ہونا چاہیے میں نے انہیں بتایا کہ خاکہ نویسی میرا واحد محبوب مشغلہ ہے۔ سب سے پہلے فائز شمس کا شمیری کا خاکہ لکھا جو ان دنوں پابند سلاسل تھے یہ خاکہ ہفت روزہ چٹان لاہور کے ۲۸ نومبر ۱۹۶۶ء کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔ میرے اساتذہ پروفیسر

ریاضِ ریدی اور پروفیسر خیالِ امر دہوی نے خاکہ کی بے حد تعریف کی میرا حوصلہ بڑھایا۔ ان کی حوصلہ افزائی رنگ لائی اور میں نے دوستوں پر طبع آزمائی شروع کی مگر ان خاکوں کو چھپوانے کا خیال آج تک نہیں آیا۔ وارثی صاحب نے مشفقانہ مشورہ دیا: ”انہیں کتابی صورت میں چھپوا دو۔“ ان کی طباعت تمہیں کبھی نہ کبھی فائدہ دے گی۔“ وارثی صاحب کے حکم کی تعمیل میں عزیزانِ محترم حک و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش خدمت ہے۔ سیکھر رشپ اگرچہ نہ ملی مگر مصنف ضرور بن گئے۔ استاد محترم وارثی صاحب کی میحافی میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

عزیزانِ محترم صرف پھولوں پر غفلت نہیں اس میں تو کیلئے اور زہریلے کانٹے بھی ہیں۔ پھولوں کے حسن کو اُجاگر کرنے کے لئے ان کانٹوں کو دانستہ رہنے دیا ہے۔ کیونکہ بقول جگر مراد آبادیؒ

گلشنِ پرست ہوں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی چاہ کئے جا رہا ہوں میں

اس کتاب میں اگر آپ کا حوصلہ ان افکار پریشاں کو جو ان اوراق پریشاں پر پھیلے ہوئے ہیں، کتاب ماننے کی اجازت دے، عزیزانِ محترم کے علاوہ سید ختمس الحسن جعفری سیکرٹری ایجوکیشن بورڈ ملتان، علامہ غلام شبیر بخاری ڈائریکٹر ایجوکیشن ملتان، قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم، سید منظور علی شمس، ڈاکٹر سید عبداللہ خواب زادہ نصر اللہ خاں، مولانا کوثر نیازی اور آغا شورش کا شیمیری جیسے بزرگانِ محترم کے خاکے بھی شامل ہیں۔ ان بزرگوں کی خاکہ نویسی کے وقت بڑی

اعتیاض برتی گئی ہے۔ راہوار قلم کی باگ بڑی مضبوطی سے تھامی گئی ہے۔
 کہ کہیں خاک نہ اڑنے پائے پھر بھی اُن کے اُجلے دامنوں پر ہیں
 غبار چڑ گیا سو تو پلکوں سے جا رو بکشی کر لے کو تیار ہوں۔
 راقم کا کسی ادبی حلقے سے تعلق ہے نہ کسی انجمن ستائش باہمی سے
 واسطہ۔ ان خاکوں کو کتابی صورت ایک استاد کی خواہش کے احترام میں
 دی گئی ہے باقی نہ صلہ کی پروا ہے نہ واو کی طلب ہے
 ہم خون جگر لے کر بازار میں آئے ہیں
 کیا دام لگاتے ہیں لفظوں کی دکان دالے

عبدالعزیز بلوچ
 ایم۔ اے

ملتان، ستمبر ۱۹۷۷ء

تعارف

از قلم شیخ حبیب الرحمن بٹالوی ایم۔ اے (اردو) ایم۔ اے (فارسی)
 ایم۔ اے (اسلامیات) ایم۔ او۔ ایل
 دقاثر نانوی تعلیمی بورڈ ملتان میں آپ کو اگر کوئی حال مست، بال پریشاں
 بڑی بڑی غلافی آنکھوں، لمبی ہلکوں، گھنی ابرو، گندمی رنگت، ریش غائب،
 بردت حاضر ہاتھ میں خائل تھامے، پیار سے سے قد والی شخصیت نظر آئے تو
 سمجھ لیجئے یہی حضرت عبدالعزیز بلوچ ہیں۔ آبائی مسکن نہ اصفہان نہ بخارا نہ سمرقند
 بلوچستان کی وادیاں ان کے آباؤ اجداد سے واقف ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ
 آزادی تک سپاہ گری کے جوہر دکھائے۔ مرد زمانہ کے ساتھ ساتھ حالات
 بدلے۔ پیشہ آبار سپہ گری کو خیر باد کہہ کر ان کے پردادانے تجارت کو اپنایا۔
 اور نقل مکانی کر کے ملتان چلے آئے۔ ان کے گھرانے میں انگریز کی ملازمت
 اور انگریزی تعلیم کفر سمجھی جاتی تھی۔ یہ کفران کے داوانے توڑا۔ انگریزی تعلیم بھی
 حاصل کی اور انگریز کی ملازمت (اسٹیشن ماسٹری) بھی کی۔ غالباً عزیز صاحب
 خاندان میں پہلے فرد ہیں جنہوں نے بے سرو سامانی کے عالم میں گریجو ایشن
 کا امتحان دیا اور اول درجے میں کامیابی حاصل کی۔ اکبر نے نوذاغ کہا تھا
 کہ

شوق یلٹے سول سروں نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا کہ تنگونی کر دیا تلوں کو
مگر ان کے ساتھ واقعہ یہی حادثہ ہوا کہ کئی دفاتر کے طواف اور صحرانوردی کے
بعد بلا آخر شمالوی تعلیمی بورڈ ملتان کی تشکیل پر قسمت نے یاوری کی۔ اور
اب تک بورڈ کی خدمت کر رہے ہیں۔ اکبر نے کہا تھا کہ سہ
چار دن کی زندگی سے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کھر کی کڑا خوشی سے پھول جا
مگر عزیز صاحب ڈبل روٹی کی بجائے لخت جگر کھاتے ہیں۔ کھر کی کرتے
ہیں مگر ناخوشی سے۔ کھر کی ملنے کی خوشی میں پھولتے نہیں سکتے چلے
جا رہے ہیں۔

یہ تو تھا مصنف کا مختصر سائنس ————— اب میں عزیزان محترم
کی طرف آتا ہوں انسان کی زندگی میں کئی ایسے چہرے سامنے سے گزرتے
ہیں کہ دل خود بخود چاہتا ہے کہ ان سے دوستی اختیار کی جائے —
بعض چہرے اپنی خدا داد صلاحیتوں سے دل موہ لیتے ہیں اور انسان حقیقتاً
ان کا احترام کرنا لازم سمجھتا ہے اور بعض کی باتوں سے آدمی متاثر ہوئے بغیر
نہیں رہتا — کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض خوبصورت چہرے آنکھوں کو اور
بعض خوبصورت الفاظ کا زور کو دھوکا دے جاتے ہیں۔

اس ساری واردات قلب کو شاعر اپنے اشعار میں مقترانہ تصویروں میں
مصورانہ تصویروں میں اور ایک ادیب اپنے ادب کی چاشنی میں بیان کرتا ہے

ادب و ادب میں اسی صنف کا نام خاکہ نویسی ہے جس پر مصنف نے جرمہ اولین میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس فن کے ذریعے کسی انسان کے اندرونی اور بیرونی دونوں چہروں کو سہل نقاب کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جس کی قلمی تصویر کھینچنا مقصود ہو، لکھنے والے کا اس سے تعلق خاطر رہا ہو چاہے وہ الفت کی صورت میں ہو یا نفرت کی صورت میں۔

عزیزان محترم میں جتنے چہرے شامل ہیں ان کی تصویر کھینچنے میں مصنف کہاں تک کامیاب رہا ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے اس میں کتنی خوبیاں ہیں۔ نہ گم نہ بگ بزم اکہ کچھ کہہ سکوں بہت اچھی بات ضرور ہے کہ عزیز صاحب کے ان دوستوں میں آپ اپنے دوستوں کو بھی پتا پھرتا پائیں گے۔ دوستوں پر طبع آزمائی نہ بھی کرتے صرف قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم، سید مظفر علی شمس، ڈاکٹر سید عبدالرشید، نواب زادہ نصر اللہ شاہ اور آغا شورش کا خمیری کے خاکے ہی انہیں ادب میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں عزیز صاحب نے ڈوب کر لکھا ہے اور اپنی عقیدت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ قارئین کرام ان کو پڑھ کر میری ہمنوائی کریں گے۔

ایک بات اور جو مجھے عزیز صاحب سے کہنی ہے وہ یہ کہ وہ محالات سے مایوس نہ ہوں۔ پیکر و شب طے یا نئے تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھیں کہ انہیں سے نہ صرف خاکہ نویسی کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہوگا بلکہ ادب و ادب کے طالب علم کو کچھ اور لطف کی باتیں ملتی رہیں گی۔

میں نے ساری عمر اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی
ایک زندگی مستعار لایا تھا کچھ ریل میں گذر گئی۔ کچھ جیل میں گذر
گئی۔ (امیر شریعت)

تعارف

از قلم پروفیسر عاصی کوٹالی

میں نے عبدالعزیز بلوچ کی فلمی کاوشوں کو عزیزان محترم کا جستہ جستہ مطالعہ کیا ہے یہ زیادہ تر ان کے ذاتی دوستوں، مٹان کے امتحانی بورڈ کی بعض شخصیتوں کے فلمی چہرے ہیں۔ علاوہ ازیں دو تین بزرگ مٹان کی علمی و ادبی زندگی کے میدان میں عرف رکھتے ہیں۔ چند شخصیات (قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم، سید مظفر علی شمس، سید عبداللہ، نور ابراہیم نصر اللہ خاں اور شورش کش کاشمیری وغیرہ) الٹی اور ٹی وارے میں آتی ہیں۔ اس طرح مصنف نے نہ صرف اہل مٹان کے لئے بلکہ اہل پاکستان کے لئے بھی مطالعے کی بباط پھیلائی ہے۔ میں چھوٹے اور بڑے دائروں کے تعین کا قائل نہیں ہوں اصل شے جاننا نہیں جانتا ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی مخصوص حلقے میں مانا جاتا ہے تو وہ اپنی جگہ مستحکم اور متحکم ہے۔ یہی اختلافی لائے کی بات، تو صحت مند اور مثبت انداز میں ہر وقت اس کی نجائش ہے۔

بلوچ صاحب نے ناکہ نویسی میں متانت کے ساتھ شہرارت اور منجیدگی کے ساتھ ظرافت کیلپیونڈنگ کر کتاب کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ کہیں کہیں مزاح میں اعتدال سے تجاوز ہے مگر مصنف کے غلوں نیت کے نقش کے ساتھ ممدوح اسے

وصلے اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل لیتا ہے اور شاید بڑا نہیں مانتا۔ تحریر میں مسلسل ایک تازگی اور دلچسپی کا احساس طاری رہتا ہے۔ اس کی فائنا ایک وجہ یہ ہے کہ یہ خاکے کسی شخصیت کے مزاج، افتاد طبع، عادات و خصائل اور مشاغل کے نوکر کے علاوہ رنگارنگ واقعات و کوائف سے بھی لبریز ہیں۔ احوال کی یہ رنگارنگی قاری کو محفوظ کرتی ہے، چاہے وہ ممدوح کو قریب سے نہ بھی جانتا ہو۔ اس پہلو کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ہمیں قاری کی عدم واقفیت مطالعے میں رکاوٹ نہ پیدا کر دے، اس لئے شخصیت کا مناسب تعارف مہیج ہے جس میں ضروری قدر و خال سامنے آجاتے ہیں۔ بعض مقامات پر فنی معلومات سامنے آتی ہیں اور مطالعے کی فضا کو شاداب کر جاتی ہیں۔ ظریفانہ نکتوں میں اردو کے علاوہ پنجابی اور سرسنگی زبان سے بھی کام لیا گیا ہے۔ شعروں کا استعمال پر عمل ہے اسی لئے لطف انگیز بھی ہے۔

مصنف کہیں کہیں اپنی ذات (جو ہمارے دیگر گروں معاشرے کا ہی ایک حصہ ہے) کی نا آسودگی یا محرومی کے احساس کی شدت میں گرفتار ہو گیا ہے خصوصاً معاشی اور معاشرتی فضا کے اظہار میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس شدت احساس نے جھنجھلاہٹ پیدا کی ہے اور یہ جھنجھلاہٹ قدرتی امر ہے۔ غالب جیسے جوان ظریف نے بھی تو کہا تھا کہ

کیوں گردشِ مدام سے گھبرائے دل

انساں ہوں، پیالہ دستِ آغوش نہیں

اس قدرتی جھنجھلاہٹ کے سبب تحریر کی شکل قدیم سے مجروح ہوئی ہے

تاہم گلاب کے ساتھ کچھ کائناتیں بھی ضروری ہیں تاکہ تضاد اور تقابل کی فضا میں
گلاب کا حسن قاری کے ذوق جمالیات کو زیادہ آسودہ کر سکے۔
میری دعا ہے کہ یہ نگارستانہ تحریر رنگ قبول حاصل کرے۔ اور خاکہ نویسی
کے چمن کی رنگ و رعنائی میں اضافے کا موجب ہو سکے۔

عاصی کزنالی

۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء

میں نے پلوں سے دریا یہ دتک دی ہے
میں وہ سائل ہوں، جسے کوئی صدایا نہیں،
(سازمیر تقی، جوم)

راؤ آفتاب احمد خاں

اے غائب از نظر کہ شدی ہمیشہ دل

میں غیبت عیاں و دعا میں غرستمت

میرے بچپن کے دھندلے وقت کا ذکر ہے کہ ایک بڑے میاں اپنے پوتے کو ایم۔ بی پر امری سکول کڑی افغاناں میں داخل کرانے آئے ماسٹر صاحب انہیں دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے میاں کو بڑی عزت و تکریم سے بٹھایا اور چھوٹے میاں کو نہ صرف چوتھی جماعت میں داخل کر دیا بلکہ اسے کلاس کا مانیٹر بھی مقرر کر دیا۔ میرے برابر انہیں جگہ ملی اور اس قربت نے چند نفل میں دوستی کا روپ و حار لیا جب بڑے میاں واپس چلے گئے تو ماسٹر صاحب نے کلاس کو بتایا کہ بڑے میاں ملک کے مشہور سیاسی لیڈر راؤ خورشید علی خاں کے والد تھے مگر میں ان دنوں سیاست اور سیاسی لیڈر کے مفہوم تک سے نا آشنا تھا۔

بچپن کا ایک یادگار واقعہ حاصل زندگی ہے۔ ہمارے ایک ہم جماعت مطیع اللہ خاں کو خدا جالے ہم سے کیا بڑھتا کہ حضرت ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ نتیجتاً ایک دن انتھاپائی ہو گئی۔ مگر یہ ایک

عجیب لڑائی تھی۔ آفتاب صاحب تو باوجود اپنے ذلیل و ذل کے پٹنے پر رو
ہے تھے اور راقم اسے رونا دیکھ کر رو رہا تھا
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفٹ

یوں بھاگتا تھا مارشل لانا زل ہوئے تو یہ اپنے والد کے ساتھ
ساہیوال چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ نشان سے جاتے
وقت اپنا آئینہ بھی دے کر نہ گئے اور نہ ہی مجھے خط لکھا۔ چند سال اسی
طرح بیت گئے پھر اچانک ان کی جانب سے خط و کتابت شروع ہو گئی
پہلے خط میں تحریر تھا: آپ مجھے بھول گئے مگر میں آپ کو بھلا نہیں سکتا۔ اور
آگے یہ دروغ گوئی کی گئی تھی: آپ کا پتہ فون سے اتر گیا تھا۔ اس لئے
خط لکھنے میں اتنی تاخیر ہوئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت اور فاصلہ محبت اور دوستی کے لئے سم قاتل
ثابت ہوتے ہیں مگر یہ دو عناصر ہماری دوستی کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ بڑے باب
کا بڑا بیٹا ہے، بکرمسرا یا خلوص و نیاز و قدر، ہر ایک صفت بہتر چہرہ
کتابی، ہونٹ گلابی، آنکھیں شرابی۔ سودا کے اس مصرعہ کی زندہ تفسیر۔
راج ساغر کو کہے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کشاہ پیشانی، خوش بختی کی نشانی، گھنی ہلکیں، راجپوتی تاک سیاہ گھنی ہونٹیں
جو اس کے گلگوں چہرے پر بھلی لگتی ہیں۔ درست کے دوست کو اپنا دوست
اور دشمن کو اپنا دشمن سمجھنے والا واحد فرد، دوستی میں منفرد و فاداری بشرط استواری
کا قاتل جیسٹوں پر مائل مگر صرف نظری طور پر جو دل میں ہے وہ لب پر ہے۔

لیا پوتی کی باتیں نہیں جانتا۔ نہ ہوا میں گرہ لگاتا ہے نہ مچھلی پر سرسول جاتا ہے
انگریزی کبھی بولتے نہیں سنا۔ عربی میں غاصد درک رکھتا ہے۔ اردو سے بھی
بگنا نہ نہیں مگر پنجابی میں فروغ سے اپنے نامور باپ کی طرح فن خطابت سے
آگاہ ہے۔ سراہیوال اس کی جنگاہ ہے۔ انیسویں اس بات کا ہے کہ قلم کا
آبی نہیں۔ اپنے عزیز ترین دوست کو دھرتی خط لکھنا بھی طبع نازک پر
گراں ہے۔ راقم کی شکایت پروانہ صاحبہ نے بار بار انہیں سرزنش کی۔
مگر نتیجہ وہی ٹھہرا کہ کسے تین پاست۔ تھپان والی کسے کو فیس احسان دانش
کے بقول سے

جاتے ہیں اس طرف کا بہت نامہ و پیام
آتی ہے اس طرف سے خبر کہ بہت ہی کم
عنان میں ان کے آنے سے قبل یا سوال میں ان سے
ملنے سے پیشتر دل میں شکوے شکایات کا ایک ٹلو مار ہوتا ہے۔ مگر جب
ملاقات ہوتی ہے تو سارے شکوے جاتے رہتے ہیں۔ میر کی سی کیفیت
ظاہری ہو جاتی ہے

جی میں تھا ان سے ملنے تو کیا کیا نہ کیے مگر
پر جب ملے، تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

تمیری رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی ہے۔ میں
علی الاطلاق کہتا ہوں کہ میں قاسم نالوتوی کا علم لے کر نکلا ہوں۔ میں
نے شیخ، ہندو محمد الحسن، کے نقش قدم پر چلنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں
زندگی بھر اسی راہ پر چلتا رہا ہوں اور چلتا رہوں گا۔ میرا اس کے سوا
کوئی موقوف نہیں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے۔ اور وہ بڑا بڑی
سامراج کی لاش کو کھانا یا دفنانا۔

(امیر شریعت)

عالمگیر مرقوم

اللہ بچنے عالمگیر بھی گیا خوب آدمی تھا۔ ایک شرعی قدا و اندر کو دھنسی
 ہوتی چینیوں کی مانند آٹھ چوبیس ہر وقت سینک میں غنوت و حق میں نہایت
 زلفت و موٹے موٹے ہونٹ کسی قدر باہر کو نکلتے ہوئے و انور و عظیم مرقوم
 حسن کے کسی معیار پر پورے نہ اترتے تھے لیکن اس بظاہر و صورت انسان
 نے طبیعت ایسی باغ و بہار پائی تھی کہ اس پر پیار آتا تھا عین ایک سلیک
 سکول کے زمانے سے تھی مگر دوستی کا ناٹھ کالج میں آکر نہ تھا۔ ایک جیسے
 مضامین رکھے اور ایک سہی سیکشن میں رہے۔ ذرا بھی سکے پیر میں عین اس
 وقت جب کلاس میں مکمل سسٹماٹاری ہو تا، مرقوم آخری انچوں سے ایسی
 آواز نکالتے کہ ہمارے پیٹ میں اور برو فیئر صاحب کے ماتھے پر بل پڑھاتے
 آواز نکالنے کے فوراً بعد ایسی متین صورت بنالیتے کہ برو فیئر صاحب کو ان
 پر خشک بھی نہ گزرتا کسی قسم ظریف لے ایسے وقت ان کی متین صورت کو دیکھا
 اور خود گما خطاب دیا۔ جسے تمام پاروں نے صرف قبولیت بخش کر ان کے نام
 کا ہر دہنا دیا۔

الفیہ اسے میں چند مخصوص دوستوں کی مغل میں ہی کھیلاتے تھے۔ مگر
 بی۔ اسے میں گٹ ہو گئے ان کی ذات عینوں کی پٹ بن گئی جس زبان

کالج آئے تو ہم جماعت پوچھتے پھرتے کہ عالمگیر صاحب آج کیوں نہیں آئے
خاص طور پر ہمارے دوست، بھل صاحب تو ان کی غیر عاضری کو شدت سے
محسوس کرتے اور فرماتے آج تو پورے کالج پر اسی چھائی ہے۔ مجھے
عالمگیر کے بغیر کالج پر محض آگاہان گذرتا ہے۔ پہلے پیر پٹہ میں دیر سے آئے۔
اکثر ایسا ہوتا کہ پیر پٹہ کے ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے ہوتے اور
یہ حضرت آن سے آن چکے عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے استاد پروفیسر
افضل صاحب اور سروں کو تو دیر سے آنے پر سرزنش کرتے مگر ان کو کچھ نہ کہتے
ایک دن مرحوم سے اس خصوصی مراعت کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔ دراصل افضل
صاحب میری پرسنلٹی (Personality) کا خیال رکھتے ہیں۔

ایک دن مجھے دعیت کی اگر خدا نخواستہ میں تم دونوں سے پہلے
انتقال کر جاؤں تو قبر میں میرے ساتھ ڈنڈا اور عینک ضرور رکھو ڈنڈا
مصرف پوچھا تو ارشاد ہوا۔ عینک کی ضرورت تو وہ محشر بھی پیش آئے گی
ڈنڈے سے منکر نیکی کی جہولوں گا۔ اگر دما میں گے تو ایک گھائیں گے بھی۔
یہ سنتے پر دار کر کے خوش ہوتے ہیں۔ میں انہیں مزہ چکھاؤں گا۔ قبر کے بعد
حشر میں دھنگیر ہوئے تو تھا کہ خوش کا یہ قطعہ سنا کہ حشر میں ایک اور حشر برپا کرونگا۔

سے محشر میں پہنار ہے ہو مجھ کو زنجیر
اک بندہ مجبور کی آخر تقصیر
آدا نہ تو دو کوئی کہہ رہی آخر
ماحول دوراقت و مرشت و تقدیر

میں نے کہا۔ ”اگر ایسا نہ ہوا تو؟“ فرما لے لگے۔ ”میاں تم ہر چیز کا تارکاب پہلو دیکھتے ہو جنت ہماری میراث ہے اور پھر قرآن مجید میں کتنی بار خدا نے خود فرمایا ہے۔ لا تقنطرو من رحمتہ اللہ“

یادش بخیر! ہمارے علاوہ ان کا ایک اور دوست بھی تھا جس سے ہماری طرح بے تکلفانہ تعلقات تھے ہمارے سامنے اکثر اس کی تعریف کرتے۔ میرے دوست جیسا مخلص شخص تو آج تک کسی ناں نے جنا ہی نہیں تم دونوں راجہ صاحب اور راقم المحررف، تو گیارہ ماہود جگر می یاڑ ہے ان کے جگر می یاڑ سے گاہے گاہے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہے وہ حضرت الفاظ ہی کی حد تک مخلص ہیں۔ بات بات پر چلو بھر خون لٹاٹھالے پر تیار۔ فارسی کی ایک قرب اشل جان می طلبی مضائقہ نیست، زرمی طلبی سخن درین است، پرکار بندہ عالمگیر مرحوم کے لئے مخلص ثابت ہوئے ہوں تو اور بات ہے۔ راقم سے جب بھی ملاقات ہوتی یہی کہتے منشا عزیز صاحب! آپ لسی پئیں گے آپ کھیر کھائیں گے، کھانا منگو اولی یا پھل؟ آپ کے لئے شربت لے آؤں گویا یہ چیزیں میرے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہیں ویسے وہ صاحب عالمگیر مرحوم کے برعکس تھے یعنی مسر و قامت، دھان پان نازک اندام و نازک خرام، مسرخ و سفید رنگت، رخسار سپا و تل جو خواجہ شیراز حافظ کے خالی ہندو اش کی یاد دلاتا تھا۔ آج تک حیران ہوں کہ تارکول اور دودھ میں ملاپ کیونکر ہوا؟

صبح دم ہی ریل میں گزرتی ہے رات کسی جیل میں گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خراب اچانک سب لوگ اس جیل میں گزرتی ہے
(امیر شریعت)

محمد اہمل

اہمل فی الواقع اہمل ہے اسم باسنی ہے اول بیدل کے اس مصرع کی
توت پھرت تصویر خ

بغیر و سحر کی، بنا ز جبار، بطرہ افسوں، بقدر قیامت
ہلک سلیک اس وقت سے ہے جب ہم دوستی کے مفہوم تک سے نا آشنا تھے
پہلے دوست ہیں جنہوں نے از خود مجھے دوست بنایا۔ نوں، دسویں جماعت
میں فارسی کا پیر پڑان کے کمرے میں لگتا تھا۔ اہمل صاحب پہلے ہی میر سے
تھے۔ سیٹ روگ لیتے تھے۔ اور حتی الامکان کسی دوسرے طالب علم کو وہاں
بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ دسویں کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا،
اور ایک ہی مضمین رکھے۔ کالج ٹھہرے دوسرے دور بوسن روڈ پر منتقل ہو گیا تو
مجھے سائیکل کی فکر امن گیر ہوئی۔ گھر پر ببتا کا نہیں پتا کا راج تھا۔ کالج فیس
پر دفیہر جاوید پر اچھ صاحب کی مساعی جملہ سے معاف ہو چکی تھی جس کے لئے
میرا روالاں روالاں ان کا سپاس گزار ہے۔ میں اب تک ان کا یہ قرض
ادا نہیں کر سکا، مگر کتابوں اور سائیکل کے لئے پریشان تھا کہ اہمل صاحب
اڑے آئے۔ اپنی کتابیں مجھے مستعار دیتے ہیں ان سے نوٹس تیار کر لیتا۔
مسل دو سال تک اپنی سائیکل پر مجھے گھر سے لے جاتے اور کالج سے واپسی

پر گھر چھوڑ بھی جاتے۔

بی۔ اے میں پڑھتے تھے کہ ایک دن فیاض رعزت مآب سید فیاض حسین زیدی بی۔ اے۔ ایل ایل بی، اور عالمگیر مرحوم کے اکاٹے پر میں نے جہل صاحب سے بیہودہ قسم کی گفتگو شروع کر دی اور سرانگلی زبان ان کے موردی لب و لہجہ میں بولی۔ ہم جماعت کو خالص اور کھری ملانی زبان سن کر ملاحظہ ہوئے مگر جہل صاحب نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر رونا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ معذرت کی۔ آنجناب کلاس روم چھوڑ کر ٹیچٹ میں آگئے اور گلوگیر آڈیو میں بولے ”عزیز صاحب یقین جانیئے، صرف آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور ایک آپ ہیں کہ دوسروں کے سامنے میری تصحیک کرتے ہیں؟“ وودہ کیا کہ آتا یہ ایسا نہیں ہوگا۔ جہل صاحب سارے ہوں اور ان کے لب و لہجہ کی نقل نہ آتا دونوں نے مجھے ملی ہوئے لگتی ہے۔ ٹوڈ میں ہوں تو خود چھوڑ دیتے ہیں اور پھر میرے منہ کو ٹکڑ ٹکڑ کر دیتے ہیں۔

جہل صاحب نے طبیعت باغ و بہار پائی ہے مگر گھر ملو جھگڑے اور برادری کی رنجشیں انہیں چین نہیں لینے دیتیں۔ پھر بھی جب ہم باہر مل بیٹھتے ہیں تو کالنج کا حسین اور بے فکر دور پھر لوٹ آتا ہے۔ کالنج کے دور میں بڑے بڑے منصوبے باندھا کرتے تھے۔ دن کی روشنی میں مستقبل کے حسین خواب دکھا کرتے تھے۔ عملی زندگی میں آئے تو تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور حسین خواب پریشاں ہو گئے۔

ج اے با آرد کہ خاک شدہ

وہ ایک بنک میں ملازم ہیں اور راقم سیکنڈری بورڈستان میں۔ ہمیں پندرہ
 دن بعد ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں بڑھتی ہوئی گرائی اور سمٹی ہوئی آمدنی
 کا روزنا روتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔
 زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
 ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
 کبھی "دستِ صبا" کا خضر دست گیری کرتا ہے اور حوصلہ دلاتا ہے کہ صبح
 بس ہے غم کی شام گر شام ہی تو ہے
 اور کبھی جگر جگر کے لئے وجہ تکیں بن جاتا ہے۔ یا یوسیوں کے تاریک بادل
 چھٹنے لگتے ہیں۔ مستقبل پھر حسین نظر آنے لگتا ہے۔
 طول غم حیات سے گھبرانہ اسے جسگر
 ایسی کبھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

منعے لگتے ہیں امیر شریعت زندہ باز دیکھئے میری
تقریر میں اس قسم کے نعے نہ لگائے، میں دونوں سے بے نیاز ہو چکا
ہوں۔ نہ مردہ باوجود کے قابل ہوں نہ زندہ باوجود کے لائق۔ مجھے تو معلوم
ہوتا ہے کہ قبرستان میں اذان سے رہا ہوں۔
(امیر شریعت)

نواب زادہ مجید اختر خاں

۵

آفاق ہاگرویدہ ام عہر شاں وزریدہ ام
بسیار خواباں دیدہ ام انا تو چیزے دیگری

آج آپ پانچ فیصدی مہربانہ داروں اور جاگیرداروں
کو روٹے میں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر وہ فیصدی
غریب بے غیرت نہ ہوتے تو آج امیر ٹھکانے پر ہوتا۔
(امیر شریعت)

ملک محمد نواز

گھر پر نہ جانے کس نام سے پکارے جاتے ہیں نازا یا نازو مگر دفتر میں
ملک محمد نواز ہیں۔ خود کو ملک امیر محمد خاں مرحوم نواب آف کالا باغ کا عزیز
بتاتے ہیں مگر بعض غلطیوں میں راز کا کہنا ہے کہ میانوالی کے مقرر رہا شند سے ہیں
اور نواب مرحوم کی زندگی میں شازدہ نادر میانوالی جلاتے تھے دانشدہ علم باصواب
گندمی رنگت، مناسب ناک نقشہ آنکھیں البتہ چھوٹی ہیں حشمتی کا کہنا ہے
کہ برہنہ پر سے آشنائی کا اثر ہے کہ آنکھیں سکڑتی چلی جا رہی ہیں ص
حدیث گرچہ ضعیف است راویان نقد اند

والا معاملہ ہے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حقہ لوشی میں تمام ڈوٹرون میں لاشریک ہیں۔
تاش کے بھی رسیا ہیں۔ کوئیے جاناں میں بھی کبھی کبھی پھیرا ڈال آتے ہیں
دل کے کھرے میں کسی کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ لوگوں کی عادت سے
کہ معمولی بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں بیار لوگوں نے عشق کے جو قصے ان کے
نام سے منسوب کر رکھے ہیں وہ حقیقت نہیں افسانہ ہیں۔

محکمہ انہار میں راقم انحراف کی ملازمت کا پہلا دن تھا۔ برآمدے میں گیا
تو ہیڈ راقمیں اور راکاؤٹنٹ صاحب کی میزوں سے پرے ایک کونے
میں ٹوٹی پھوٹی کسی پرٹانگ پر ٹانگ جماتے دیکھنا اب کو ایک چہرہ اسی سے

کو گنگو پایا۔ سٹے کی لئے ہاتھ میں تھی اور وہ ہے جان تمیحا کے ہاتھ میں بول
 رہا تھا۔ ملک صاحب چپڑا سی سے باتیں بھی کرتے جانتے تھے اور کش
 بھی لگاتے جانتے تھے، میل سی شلوار قمیض زیب تن تھی۔ سر پر منگڑ کوڑیوں لمبیٹ
 رکھا تھا جیسے جامے ہاں گوا سے پیٹے بہتے ہیں۔ یقین جانتے میں نے
 آنجناب کو بھی چپڑا سی سمجھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ذہین پھر ہیں۔ درون کے بعد انہیں
 ریکارڈ کیمرہ لگا دیا گیا۔ راکم کے سامنے صرف ایک چشمی ڈیپچ کی اور اس طرح
 انہیں ہمارا استاد بننے کا محضر بھی حاصل ہو گیا۔ خود کیس نہر غلط بتاتے اور بعد
 میں مجھ سے ناراض ہوتے۔ عزیز صاحب! آپ غیر ذمہ داری سے کام کر
 رہے ہیں میں نے نہر غلط لگاتے ہیں۔ حکومت ہی غلط کام کر رہی ہے۔ بی۔ اے
 ادا ایم۔ اے پاس کرک بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ وہ بھلا خاک توجہ سے کام
 کریں۔ ملک صاحب! حکومت بھی آپ کے فکر کی ہے ان دنوں لوہا ف
 کالا باغ مرحوم گورنر تھے، اُسے الزام ہے کہ آپ اپنی بے عزتی آپ کو مجھے
 ہیں۔ میں انہیں شہداء کرنے کی کوشش کرتا۔ ملک صاحب! بھلا آپ کے
 نزدیک کرک کے لئے کیا تعلیمی استعداد ہونا چاہیے؟ چستی صاحب! اعتبار
 کوئے ملک صاحب کی طرح ٹول پاس۔ مرزا ام کلیننگ دوسرے کوئے سے
 نمرہ لگاتے۔ میری جان چھوٹ جاتی اور ہوا کا رخ ان کی جانب مڑ جاتا۔
 مرزا اکرم ڈیپنگ دیپنگ صاحب کا عطا کردہ مقبول عام خطاب تھا۔ اصل تمام
 مرزا عمر حیات ہو گیا تھا، بھی عجیب تھے۔ کام سے فارغ ہوا ہمارے
 کرے میں آتا تھے۔ اور آج تو بڑی گرمی سے تم لوگوں نے چنگھا بھی بند کر رکھا

ہے۔ یہ کہتے کہتے ملک صاحب کے قریب پہنچ جانے اور ایک دم ان کا تعلق
 اُچک لیتے۔ ملک صاحب ایک ثانیے کے توقف کے بعد پھر ان سے مفارقت
 کر اپنے فارغ البال سر کو دوبارہ ڈھانپ لیتے اور مرزا صاحب کو متعلقہ مسیحی
 گاہیاں دیکر ہڈی کلرک صاحب کے پاس پہنچ جاتے۔ مرزا ان کے سامنے یہ
 جوڑ کر معافی مانگ لیتے اور آتے وہ ایسی ہاشاشہ حرکت دکھاتے کہ ہر عاقل
 مگر درپار دن کا وقفہ دے کر پھر یہ حرکت کر بیٹھے۔

ایک شب جیل خانہ دھوم دھوم جیل ڈھاکہ میں سورۃ
یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر چلے گا
رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ قرأت کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھہر گیا ہے۔
ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا۔ اتنے میں پنڈت رام جی لال
پرنسٹن جیل نے پکارا۔ دیکھا وہ کھڑا ہے اور رخسار اس کے
آنسو سے تر ہیں۔ کہنے لگا: شاہ جی! خدا کے لئے بس کرو۔ میرا دل
اب قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب مجھ میں روکنے کی سکت نہیں۔
اللہ! راہ قرآن کی عبت کا اعجاز تھا۔

(امیر شریعت)

انصاری صاحب

عالمگیر مرحوم کے دوست ہیں اس لئے راقم نے بھی علیک ملکہ ہے
ابو جہل کی حیثیت کے معتقد ہیں۔ سود کو حلال سمجھتے ہیں اور رشوت کو نہ صرف
جائز سمجھتے ہیں بلکہ دقت کی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ ہر برسرِ وقتہ شخص کی عظمت
کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ اختلاف ان کے رگ و ریشہ میں سمایا ہوا ہے۔
آپ کہیں کہ فلاں شخص ملک و ملت کے لئے مخلص ہے یہ فرمائیں گے کہ
نہیں وہ تو ملک و ملت کا فدا ہے۔ آپ کہیں دن ہے تو یہ کہیں گے کہ نہیں
رات ہے وہ دیکھو مجھے تو آسمان میں تار سے بھی نظر آ رہے ہیں۔

ان کے ماموں انڈول کا کاروبار کرتے ہیں انہوں نے اس کا دوبارے
کوئی فائدہ اٹھایا ہو یا نہ اٹھایا ہو، انہوں نے خوب اٹھایا ہے یہ چوری
کے انڈول کا اثر ہے کہ بھولو پہلو ان بنے پھرتے ہیں۔ کسی کو ان سے پنجرہ
آزما فی کا یا را نہیں۔ منظر کو رشتہ داری کا واسطہ ہے کہ خاموشی کرا
دیتے ہیں۔ غور کی اور لالہ کو جب چاہتے ہیں طاقت کے بل پڑھ لیتے ہیں
غور کی فلم دکھاؤ۔ حاضر جناب کو مٹھائی گوشت بھی کھائیں گے۔ بہت بہتر
حصوۂ فلم دیکھ کر اور کھائی گوشت کھا کر پٹنے ہیں راستے میں دودھ دہی کی
دکان پر نظر پڑتی ہے رک جاتے ہیں۔ لالہ! اسی پلاؤ اور ہاں مٹھائی بھی ساتھ

۸۳

ہوئے چلتے بندہ حاضر ہے۔ یہ لالہ کا جواب ہوتا ہے۔ یہ مکالمے آئے دن دہرائے
 جاتے ہیں۔ پھر مجھ پر نظر پڑتی ہے۔ عزیز! تمہاری جیب میں کیا ہے؟ نکالو۔
 میری جیب میں تو بھوتی کوڑی بھی نہیں، لہذا آجگا ٹیکس سے معاف رکھا جائے
 کر ہر ایک وصول جاکر جس کا اثر آٹھ دنوں تک رہتا ہے، مجاز معاف کیا۔
 گورارنگ۔ مناسب ناک نقشہ جسم گھیرا اور پھیلاؤ کی طرف مائل مگر آواز
 صحت مند سا پک جاتے ہیں اور اسے افسری زبان فرماتے ہیں۔ البتہ جب ملانی
 دسرا تکیا بولتے ہیں تو تعلق ملانی سن کر مزہ آتا ہے۔ آتش ملانی کی غزل ان
 کی زبان سے سنئے تو کچھ اور لطف آئے گا۔

کرفکرتوں میں یک پل دا
 ست جھگڑا اکبک ازل دا

ایویں یار نے جھاتی پاتی
 جیویں بدلوں چند رنگدا

یک غضب ہے بھیا بدن دی
 چو جھسا چو لایہ سلسل دا

توں صدیاں دی گالہ کر نیدیں
 راتھ جھیسڑا ہے پک پک دا

آسمان ظلم اندھا روی جانیں
 جھٹھاں ڈیو اپسار دا بلدا

مولانا فیضی ایم۔ اے

من از بیگانگان هرگز دنا لم
کد با من هر چه کرد، آں آسش ناکرد

آج یہ مجمع صرف مسلمانوں کا بے ٹیکنہ میں نے جب
پہلے یہاں دکرچی میں خطاب کیا تھا تو مجمع میں مسلمانوں سے
زیادہ غیر مسلم تھے اس وقت بھی میں نے کچھ آیات ہی پڑھی تھیں،
اور ان کا ترجمہ ہی بیان کیا تھا اور میرے ہاتھ پر کئی کتبوں نے اسلام
قبول کیا تھا، اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ جو کچھ تم پڑھ کر سنا تے ہو
جس میں بنی کچھ آتا ہے یہ الگ بات ہے کہ آپ مجھے
آج تک شاید کافر ہی سمجھتے ہیں۔

و اعلم انک نظر لے مجھے کا فر مانا
مرد کا فر بہت سب سے مسلمان ہوئے ہیں؟
دامیر فریعت

منظر الدین احمد

حسنِ رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایہ جہاں ہوتا ہے

میانہ قد، گندمی رنگت، بھرا بھرا گہرا جسم، گول چہرہ، ستواں ناک، موتیوں
کی لڑیلوں جیسے دانت۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ شرابی آنکھیں محاورہ نہہیں
فی الواقعہ۔ آہوان تانہ روئیں تو چوکڑی بھول جائیں۔ آپ ہیں ہمارے مخلص
دعوتِ اردو دوست — منظر الدین احمد

پہلی ملاقات غوری صاحب کی طرف سے دی گئی افطار پارٹی میں ہوئی
جہاں راقم بن بلائے مہمان کی حیثیت سے شامل تھا۔ بن بلائے مہمان کی
تشریح کسی اور وقت کے لئے، اٹھا رکھئے۔ منظر صاحب نے افطاری کیلئے
فیروزنی سب میں تقسیم کی مگر مجھے نظر انداز کر گئے۔ غوری کی توجہ دلانے پر اس طور
پر معذرت خواہی کی کہ مجھے منی آگئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منظر صاحب توجہات
کے امام ہیں۔ نماز ادا کرنے کے بعد ستر خوان پر فیصلی تعارف ہوا گھل مل گئے۔
غوری پر پینٹیوں کا جھاڑ باندھا۔ حلیف کا گھیرا دیا۔ افضل حمید پروار کیا۔ مقصود
یہ تھا کہ ان لوگوں کی توجہ کھانے سے ہٹائی جائے جو فی الواقعہ بہت لذیذ
پکا ہوا تھا مگر وہ بھی ایک کاتیاں تھے۔ باجماعت قسم کھا رکھی تھی کہ منظر کی باتوں

کا نہ بُرا منائیں گے نہ کھانے سے توجہ ہٹائیں گے۔ کھانا کھانے کے بعد اُن کا جوابی حملہ شروع ہوا۔ اور مظفر صاحب کو جان بچانا مشکل ہو گیا۔ اس ملاقات کے بعد ایک دن غوری صاحب نے مظفر صاحب کا حال پوچھا تو فرمایا: "مظفر صاحب بھی دفتر میں آپ کو یاد کر رہے تھے۔ کل اُنھے گھر چلیں گے۔" دوسرے دن میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہاں جا کر انتخاب نے جو گل کھلایا وہ قابلِ شنید ہے۔ مظفر صاحب یہ ہیں آپ کے نئے دوست عبدالغنی جن سے آپ پہلی مرتبہ میرے مکان پر مل چکے ہیں۔ انہیں آپ کی حینِ اسکھوں میں شاہدِ انزل کا جلوہ نظر آتا ہے۔ آگے بڑھو اور گلے لگ کر ملو؟ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ مگر جب مظفر صاحب نے بُرا منانے کی بجائے آگے بڑھ کر گلے لگایا تو میری سخت کسی قدر کم ہوئی۔ اب رقیبِ روسیاد کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔

آج کے مادی دور میں زسے خلوص کو کون پوچھتا ہے صبح سو دو زیاں کو نظر میں رکھ کر کرتے ہیں یا راسنے لوگ مجھے فخر ہے کہ مظفر صاحب نے پر خلوص دوستی کی اعلیٰ روایت قائم کی ہے ہر موقع پر میرے مفاد کو مقدم سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

دن گزرتے گئے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ مظفر صاحب ایک عارضی کاغذ کار ہو کر شترکالج داخل کر دیئے گئے ہیں۔ ضیف اور غوری کی معیت میں وہاں پہنچا ہوش میں تھے اور عزیز واقارب سے نہیں نہیں کہ باتیں کر رہے تھے مصیبت اور

تکلیف میں بڑے بڑوں کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے مگر ان کا حوصلہ قابلِ داد
 تھا جس جگہ سے ٹانگ ٹوٹی تھی وہ جگہ پھولی ہوئی تھی۔ خود ہر ایک کو وہ جگہ
 دکھا رہے تھے۔ ہم دوستوں کو معصوم دیکھا تو فرمایا۔ بھائی فکر کی کوئی بات نہیں
 آپ دوست میرے لئے دعا کریں۔ اور ہم دوست سوائے دعا کے اور
 کیا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کر کے پلستر کر دیا۔ چند دن بعد انہیں
 چھٹی مل گئی۔ گھر پر آ گئے۔ ہم دو چار دوست تقریباً ہر دو سہرے دن ان کی مزاج
 پرسی کر آتے اور یہ ہمارا اخلاقی فرض تھا مگر منظر صاحب اس کے لئے سرِ پاسبان
 گزارتے۔ بالآخر انہوں نے غسلِ صحت کیا تو دوستوں کی جان میں جان آئی
 دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اپنی علالت کے دوران انہوں نے اندازہ
 لگایا کہ عزیزِ نیک کو منظر کتنا عزیز ہے۔

”تم میرے بارے میں جو چاہو سوچو مسلمانوں کا
یہ شعار ہو گیا ہے کہ وہ برائیاں عقاب کی آنکھ سے چنتے اور صبا کی
دھنار سے پکڑتے ہیں۔ کبھی کبھی نیکیوں پر بھی نگاہ کر لیا کرو۔“
تمہاری نظرتیں اس سے خوبصورت ہوتی چلی جائیں گی۔
(امیر شریعت)

شفیع الدین قریشی

حسین مکراتی ہوتی آنکھیں راقم الحروف کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اگر ان حسین مکراتی ہوتی آنکھوں کا مالک سلجھا ہوا دل و دماغ رکھتا ہو، غلوت نشیں ہو، اپنے گرونام نہاد دوستوں کا ہجوم کر لینے کا مخالف ہو، اور جس کی خودی 'Ego' خود داری کی حدود سے نکل کر بد مزاجی اور آدم بیزاری کی سرحد تک نہ پہنچی ہو اسے اپنا درست بناسے بغیر چین نہیں آتا۔ شفیع صاحب کو دل کے قریب لانے میں ان کی حسین مکراتی ہوتی آنکھوں کا بڑا حصہ ہے۔

ان کی آمد کی خوشی براہیج کے ہر فرد کو تھی کیونکہ انہیں شفیع صاحب جیسا مشاق اور مستعد اسٹینوٹا پیسٹ مل گیا تھا۔ خصوصاً ہمارے دوست محمد حسین صاحب کی ٹو باجھیں کھلی ہوتی تھیں۔ مردہ چہرے پر تروتازگی کے آٹا ایک تخت پیدا ہو گئے تھے۔ جب عادت ٹائپ کرانے کے لئے شفیع صاحب پر پوٹو ڈال رہے تھے مگر میری خوشی کا سبب کچھ اور تھا یعنی وہی جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں آچکا ہے۔

میانہ قد، گندمی رنگت، ہلکا پھلکا ڈیل وڈل یعنی رحمان پان نازک اندام راؤ آفتاب کی طرح کشادہ پیشانی، خوش سنجی کی نشانی، ستوال ناک، باریک مونچھیں، گلابی ہونٹ، مفید دانش، دانتوں میں کہیں کہیں کھڑکیاں، لمبی گھنی

پکیں، مصور فطرت کے موزے قلم کا شہکار، کمان کی مانند ابرو اور آنکھیں،
حدِ توصیف سے بڑھ کر حسین اور شرابیِ عالم نے انہیں آنکھوں کے لئے
کہا ہے۔

میکدے میں تو چند خُصم ہو گئے
تیری آنکھوں میں چشمہ مے ہے

مراد آباد کے مہاجر ہیں اور میری مراد ہیں تقسیم کے بعد ان کا خاندان گجرات والہ
میں آباد ہو گیا۔ ازاں بعد پٹان منتقل ہوا۔ گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول سے
میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹر کالج میں داخلہ لیا۔ بالی عمر یا میں کسی کی زلف
گرد گیر کے اسیر ہو گئے۔ تعلیم کو اچھوڑا کر والدین شادی کرنے پر راضی
نہ ہوئے لہذا لڑکی کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ نتیجتاً شفیع صاحب افسانہ نویس
بن گئے۔ شاعری کا بھوت بھی انہی دنوں میں ان کے سر پر سوار ہوا تھا مگر ایک
استاد کے کہنے پر شاعری سے دست بردار ہو گئے وگرنہ اب تک صاحبِ اولاد
یعنی صاحبِ دیوان ہوتے اور بات بات پر فرماتے: اماں ایک مصرع
عجب سوچا ہے۔ ایسا مصرع تو آج تک اردو کے کسی شاعر کو نہیں سوچا
ہوگا۔ واللہ غور سے سنئے۔ عوش کیلئے مے اور جب آپ سراپا گوش بن کر
غاموش ہو جاتے تو شفیع صاحب سر کو کھجانے لگ جاتے اور بالآخر فرماتے کہ
عشق عناقے مضمونِ وام میں آکر نکل گیا

ایک دن مجھ سے پوچھا میری صاحبہ شعر کیسے ہے جس میں منہی کے نفس کا
ذکر ہے۔ میرے ذہن میں صرف ایک مصرع جھول رہا تھا: اہلِ بات بنائی

کہ میاں کالج کے دور میں شعری شعریاں دیتے بورڈ کی ملازمت میں کیا آئے داغ
کو رنگ رنگ گیا ہے نادری حکم دیا کہ اب شعریاں کرنا ہوں گے وعدہ کیا کہ حکم
کی تعمیل ہوگی۔ آنجناب کا مطلوبہ شعر یہ تھا۔

شاعر کی نوا ہو نہ نغمی کا نقش ہو

جس سے جہن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا (اقبال)

عوشی اس بات کی ہے کہ نہ صرف خود شاعر فطرت کے حسین شعر ہیں بلکہ شعر بھی کا
اعلیٰ درجہ کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ میر سے دوستوں میں سے واحد فرد ہیں جنہیں
لی اراقی شعر و ادب سے لگاؤ ہے۔ تمام معروف شعراء کے چیدہ چیدہ اشعار
ازہر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ان کے پسندیدہ شاعر ہیں اور اس پسندیدگی کی
بڑی وجہ قاسمی صاحب کے گفتار و کردار کی مماثلت بتاتے ہیں ان کا یہ شعر
اکثر ان کی زبان پر رہتا ہے۔

میر بھ رنگ نہ ن کر تے رہے اہل دین

یہ الگ بات کہ وہ نائیں گے غزل کے ساتھ

احمد ندیم قاسمی پر بات ہو رہی تھی کہ میر سے پسندیدہ شاعر کے بارے میں پوچھا
میں نے جواب دیا کہ عمر کے ساتھ ساتھ پسندیدہ شاعر بھی بدلتے رہتے ہیں۔
مرحومین میں غالب اور اقبال زندہ شعراء میں جوش اور مقدم میر سے پسندیدہ
شاعر ہیں۔ جوش کا نام مثنیٰ کر انہیں جوش آگیا۔ کہنے لگے جوش بڑھا ہوا چکا ہے
چمکے ہوئے تواسے چمکے جاتا ہے۔ خیالات میں پہلی سی آد نہیں رہی
پھر آپ کے پسندیدہ شاعر کا نثری کا نام یادوں کی برات پڑھ کر ہوا ابھرتا ہے

وہ قابلِ علامت ہے۔ میں نے جوش کی مدافعت کی تھیں، جوش اپنی تمام تر
 بشری گزوریوں کے باوجود آج بھی امام الشعر ہے جس طرح بیسویں صدی کی
 دوسری تیسری دہائیوں میں اس کی آواز میں ایک انقلابی گمن گرج، خیالات
 میں بلند آہنگی، میر کا روال کا لب و لہجہ اور زبان و بیان پر ماہر اندوشرس تھی
 وہ آج بھی موجود ہے۔ اردو نظم کی پوری تاریخ میں میر انیس کو چھوڑ کر الفاظ و محاورات
 تشبیہ و استعارہ کا جو بیش بہا خزانہ جوش نے اردو زبان پر بچھا دیا ہے۔
 اس کے لئے موجودہ اور آئندہ نسل کو جوش کا ممنون ہونا چاہیے۔ شاعرِ دلی
 کے کردار کے بارے میں کچھ نہ کہیں چند ایک کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر کا کردار موندنا
 نہیں بلکہ کافر اند رہا ہے۔ جی تو قرآن مجید نے چودہ سو سال پیشتر ان کی راہ کو
 گمراہی کی راہ بتایا تھا۔ آپ جوش کو بطور ایک قادر الکلام، امامِ سخن شاعر
 کے پیش نظر رکھیں تو اس کی عظمت ماننے بغیر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔
 شورش ایسے ہاتھ اویب نے جوش کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔
 شاعری تو ان کی بہر حال ہمالہ کی رفعتوں سے ہم کلام ہے۔ بسا اوقات سداۃ المنشی
 تک چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر اس آرزو میں
 ایستادہ ہیں کہ ان کا قلم انہیں سلکِ معافی میں پروئے اور وہ ان کے رشتہ نگار
 سے شکایت ہو کر بلا بلند ہو جائیں الفاظ کی بناکاری اور طالب کی سحرکاری اس
 سن و سال میں بھی صرف جوش ہی کے خامہ عنبر شمار کا مستحق ہے؟
 بھلا جو شخص اس پرانہ سالی میں ایسے حسین شعر کہتا ہو اس کی شاعرانہ عظمت
 سے آپ کسی طرح انکار کر سکتے ہیں۔

ۛ دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی
ۛ آپ کرتے ہی جائے باتیں
مجھ کو اونچا سنانی دیتا ہے
ۛ ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کیلئے
اگر رسول نہ آتے تو صبح کافی بھٹی

شفیع صاحب کا جو شش قدر سے مدہم ہوا۔

اردو کے علاوہ انہیں پنجابی کے بھی چوندے چوندے اشعار ازبر ہیں۔
ایک دن خواجہ غلام فرید کی مشہور کافی بھی دوستوں کی ایک محفل میں سنائی
ادائیگی قابل دید اور آواز قابلِ شفیق تھی ۛ

وے میم لال میگوں جسے نہ لٹے
میگوں رخصیا یا رمنسا ورتڑے
کنجری نبرڈے میڈی عورت نہ ٹھنڈی
میگوں کنج کنج یا رمنسا ورتڑے

کسی نے کونے سے آواز لگائی "شفیع صاحب اشوق سے شوق پورا کیجئے۔"
شرما گئے اور شفیع صاحب کا شرمانا ایسا ہوتا ہے۔ جیسے چودہ سال کی شرمیلی
لڑکی اپنے ہونے والے دو لہبا کا نام سن کر شرماتی ہے۔ آج کل پی۔ آئی۔ اے
میں ہیں اور "پیا آ آ" کی مناسبت سے کچھ ادھ لہانے اور شرمانے لگ
گئے ہیں۔

اب ہم آزاد ہیں اور میری جیتھی رائے ہے کہ آزاد
ملک کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ آزاد ملک پر چاروں طرف سے
نگاہیں پڑتی ہیں۔ ہر لالچی، طماع، سونے چاندی کا بھوکا، زمین کا
بھوکا، آزاد ملک پر حرص کی نظر ڈالتا ہے۔ یہ مت سوچئے کہ ہماری
سرحدنگی پڑی ہے۔ سرحدیں کپڑوں سے نہیں، خون سے ڈھانپی
جاتی ہیں۔ جہاں مجاہدین کا خون گاتا ہے وہاں سرحد بن جاتی ہے
جنگ ہو یا نہ ہو آپ کو بہر حال تحفظ پاکستان کیلئے تیار رہنا چاہیے
(امیر شریعت)

بلیک بیوٹی

۵

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترتا
ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

”یہ فرسودہ نظام ہے، تم نے اسے پرکھا ہی کب ہے،
جو یہ فرسودہ ہو گیا، تم نے اس کا چہرہ دیکھا ہی کب ہے۔ ساری عمر
مُحاسبہ کے دفتر میں جھک ماری اور اسلام کو کہا کہ اسلام فٹ نہیں آتا
اسے کم بخت تو اسلام پرفٹ نہیں آتا تیری غفلت اس پرفٹ نہیں پہنچتی“
(امیر شریعت)

ظفر صاحب

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ مخلص دوست اللہ کی نعمت ہے اور ظفر صاحب بھی میرے چند گئے چنے مخلص دوستوں میں سے ہیں اگرچہ آنجناب کبھی کبھی نادان دوست ثابت ہوتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پہنچانا چاہتے ہیں مجھے فائدہ لیکن ہو جاتا ہے نقصان اور جب میں بگڑ کر رہا ہوں تو نہایت سادگی سے فرماتے ہیں ”خدا کی مرضی“

ظفر صاحب فلاسفر، شاعر، افسانہ نویس اور مصوّر ہیں، شاعری اور مصوری میں جدیدیت کے قائل ہیں یعنی جب تک شاعر یا مصوّر خود اپنے شعر یا آرٹ کی تشریح و توضیح خود نہ کرے قاری یا ناظر کے لیے کچھ نہیں پڑتا۔ آنجناب کے اپنے الفاظ میں ”آئین شاعری میں قافیہ ردیف اور زحور کو قید یا مشقت سمجھتا ہوں“، بارہا منع کیا کہ شاعری اور مصوری کا پسند چھوڑیں اور صرف افسانہ نویسی کی طرف توجہ دیں کیونکہ اس میدان میں ان کا شہسب قلم بگٹھ دوڑتا ہے۔ ہر پچھٹے میں ٹانگ اڑانے کی وجہ سے ایک مشغلے کی طرف پوری توجہ نہیں کر پاتے اور عدم فرصت کا ردِ نامہ لکھ رہے رہتے رہتے ہیں۔

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن دو فائلوں میں کٹ گئے دو امتحان میں

ظفر صاحب ضلع جلگت کے بھی استاد ہیں۔ نام بگاڑنے میں بیڑی طواری رکھتے ہیں۔ الفاظ و اشخاص کا تجزیہ کرنا ان پر بس ہے۔ مشتے نمونہ از خود ارے۔
ایک دن کسی نے سرانیک کی زبان کا مذاق اڑایا۔ ظفر صاحب بڑے تمہیں کیا معلوم سرانیک تو ایک مستشرق Sir Aaki کی زبان تھی جو یہاں کے لوگوں نے خیر سگالی کے طور پر اپنائی۔ اگر آپ اس روایت پر ایمان بالغیب نہیں لاتے تو ایمان بالغیب "لا کر اپنی عاقبت" تو خراب نہ کریں۔ ذرا سرانیک کی املا پر غور کریں۔ اسے سڑکا خطاب تو قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔
ایک دن ایک دوست کے پیٹ میں سخت درد ہوا تو اسے فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر ادا نہ کرو۔ درد نہ رہا تو بے درد" دیدر دہن جاؤ گے آپ نے نہیں سنا۔ ع

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ایک دوست جس کا نام نواز تھا اسکا رکا ہوا کام بن گیا تو اس نے ظفر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "نواز ش" برجستہ کہا "میاں تمہیں اپنے نام کے آگے صرف ایک لفظ ش" کا اضافہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری تو سینگ لگی نہ پھٹکری۔
جس طرح ہمارے کاروباری حضرات ایک دوسرے کو سمجھانے کے لئے خفیہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا گاہکوں کو مطلقاً پتہ نہیں چلتا اسی طرح انتخاب نے الہا کے توڑ کے لئے یہ خفیہ الفاظ گھڑے ہوئے ہیں۔
پرائمری = پانچ روپے، میڈیکل = دس روپے، ڈبل میٹرک = بیس روپے، ایف اے = بارہ روپے، ڈبل ایف اے = چوبیس روپے اور ڈبل ایم اے =

تیس روپے، علیٰ ہذا القیاس مثلاً دکاندار نے پچاس روپے مانگے ہیں تو آنجناب اپنے ساتھی سے مشورہ کریں گے کیوں ”میاں ڈبل ایم، اے (یعنی تیس روپے) کیے رہیں گے یا ایک پرائمری (یعنی پانچ روپے) کا اور اضافہ کر دیا جائے“ اور پھر دوکاندار کو تیس روپے یا پانچ روپے یعنی تیس روپے بتائیں گے۔
دفتر دیر سے آئیں گے کوئی پوچھے تو ارشاد فرمائیں گے ”افسر بننے کی کوشش کر رہا ہوں“

”مگر ظفر صاحب اب تو عوامی دور ہے افسر بھی کبھی دقت پر پہنچ ہی جلتے ہیں۔ کوئی انہیں چھیڑے گا۔“
”بے شک“ عوامی دور ہے یعنی عوام کا دور ہے مگر میں تو عوام سے اپنے آپ کو الگ سمجھتا ہوں“ آنجناب جواب دیں گے۔ ایک دن پورا گھنٹہ دیر سے پیچھے تو اس وقت کے سپرنٹنڈنٹ شیخ انور حسین (بقول میاں شریف جناب شیخ الہند نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ سرکاری گھڑی گھنٹہ گھر پر ابھی سات ہی بجے تھے میں گورنمنٹ کے حساب سے وقت پر پہنچا ہوں شیخ صاحب نے کہا کہ نشان کے ٹاؤن ہال کی گھڑی تو اکثر دیشتر افسروں کے مزاج کی طرح خراب رہتی ہے اس کا کیا اعتبار؟ ظفر صاحب نے شیخ صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ گورنمنٹ کی گھڑی کبھی غلط نہیں ہو سکتی ہمارے گھڑیاں غلط ہو سکتی ہیں۔“

ایک دن دفتر میں وقفہ کا وقت اس بحث میں گزر گیا کہ ہمارے والے میں سب سے زیادہ خوبصورت کون ہے۔ بڑی دیر تک ہنگامہ آرائی نہ ہو

بالآخر اتفاق رائے ریاض صاحب (کنٹرولر امتحانات ملتان بورڈ) کے حق میں یہ کراری "قرار داد پاس ہو گئی۔

"اچھا افسروں میں سے تو ریاض صاحب بازی لے گئے۔ بہرحال حسن علی "صبح" شام اودھ" اور صبح بنارس" کا بھی جواب نہیں۔ باقی شاف میں سے یہ بازی کون جیتے گا؟ کسی نے سوال اٹھایا ایوان "میں پھر گرما کر می پیدا ہو گئی۔ ظفر صاحب بولے میرے ہوتے ہوئے کوئی اور یہ بازی نہیں جیت سکتا۔ ظفر صاحب آپ کو رے چنے ضرور ہیں مگر آپ کی چپٹی ناک تو آپ کا ناک کٹوا دے گی" کسی نے صاف گوئی کا حق ادا کیا۔

"ہاں چپٹی ضرور ہے مگر آپ کی ناک کی طرح الم ناک" دالمناک، تو نہیں ہے" ظفر صاحب نے فوراً کہا اور ان صاحب کا منہ لٹک گیا۔ میں نے کہا بھلا ہمارے یار محمود الحسن قریشی کے بارے میں ایوان "کی کیا رائے ہے جسے ہمارے پیرچی" بھی گورا چٹا اسٹینٹو کہہ کر بلاتے ہیں۔

وہ ایکس کیڈر (EX. CADRE) کا آدمی ہے۔ ایوان کے سارے ممبر بیک وقت چیخ اٹھے۔ مجبوراً مجھے اپنی تجویز واپس لینا پڑ گئی۔ "میرے ہوتے ہوئے دوسروں کا نام لے کر آپ میرے حسن کی توہین کر رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مجھے دایہ نے سات اعلیٰ نسل کے صابنوں سے پرائمری غسل کرایا تھا" ظفر صاحب نے پھر منہ کھولا مگر ایوان کے ارکان "تا دیر کسی فیصلے پر نہ پہنچ پائے کیونکہ ہر ایک کو یہ زعم تھا کہ محمود من دیگرے نیست حتی کہ دفعہ کی گھنٹی بج گئی ظفر صاحب کنوارا لیک" تھے سب سے سیڑ ممبر تھے ان کی شادی

خانہ آبادی کے بعد یہ اعزاز ہمارے دوست چوہدری محمد حسین کو خود بخود حاصل ہو گیا۔

اس چہرہ نما سے آپ کو ظفر صاحب سے پہلے بہت پیش نہ آئیگی
گوری جیٹی رنگت، بیضوی چہرہ، کشادہ پیشانی، گھنی پکیں، چھوٹی آنکھیں،
قدرے چھٹی ناک مگر ایسی نہیں کہ جس پر انگشت نمائی کی جا سکے، سفید دانت
کھلا دہانہ، درمیانہ قد، ممت، بھاری جسم، کبھی کرتہ شلوار میں طبعوس
کبھی سوٹ بٹ زریب بدن جس دن سوٹ پہن کر آتے ہیں ہر ایک سے
پوچھتے پھرتے ہیں کیوں میاں میں افسر نظر آتا ہوں یا نہیں؟ احمد یار چڑا ہی
نظر نہ آئے تو پوچھتے ہیں آج ہمارا پی۔ اے نظر نہیں آتا اور یہ میں ہمارے
چمنستان لورڈ کے طوطی خوشنوا۔ چوہدری غضنفر علی اسٹنڈٹ،
اسحاق نسیم، ظفر اقبال امداد، قلم التحریر کے مصنف اور ہم تعدیر یعنی
کلرک بادشاہ۔ جناب ظفر احمد صاحب

جس شہر میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس شہر کے سلطان سے کوئی بھول ہوئی
تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
اس باغ کے مالی سے کوئی بھول ہوئی ہے
(امیر شریعتؒ)

شوکت لغاری

دعا کنت کہ بیگانہ آشنا گرد
ترا چہ شد کہ منی پرسی آشنائے را

دولت مند کا دل دولت کے بوجھ تلے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ پڑھا طالب علمی کے زمانے میں تھا، ایمان اب عمل زندہ گی میں آکر لانا پڑا۔ پائلٹ سیکنڈری سکول ملتان میں کبھی عزیز اور شوکت ایک جان دو قالب تھے۔ کالج کے دور میں بھی یہ رشتہ قائم رہا۔ مگر شک کی منجبری ملے ہی ان کے طرز عمل میں فرق آگیا اکثر دوستوں کو گلہ ہے کہ شوکت پہلے والا سنس مکھ، یاہوں پہ جاں نثار کرنے والا شوکت نہیں رہا۔

برادر مہم کیپٹن عبدالملک پراچہ کی دعوت ولیمہ میں مجھ کھد پویش کو نکھیل دیکھتے رہے مگر سو فرسے اٹھنا گوارا نہ کیا۔ دعوت کھانے کے بعد راقم ان سے ملنے کے لئے قریب گیا تو مجھے دیکھ کر یوں کہنی کتر لگے۔ جس طرح تیسری جنس کے کسی فرد کو رہزنی بات کہہ دی جائے اور وہ ناک پر انگلی رکھ کر آف انڈیا کہہ کر ایک جھٹکے سے پاس سے نکل جائے۔ جی میں آیا کہہ دوں کہ صبح منجھ بن کے تم بڑے آدمی ہوئے مگر دل کی بات لب پر نہ آسکی۔ تیسری آنکھوں کے سامنے وہ بھولا بھالا گنہ گار

زنگت، ستواں ناک، گھنی بھوئیں، لمبی پکیں بڑی مگر نیم دانکھوں والا شوکت لغاری
آن کھڑا ہوا جو دوستوں کے لئے بچھا جاتا تھا۔ ہر شکل میں دوستوں کی دستگیری
کرتا تھا۔ جسے دوستوں کی جدائی بڑی گراں گذرتی تھی۔ جو دوستوں سے ملنے
کے لئے ان کے گھروں کے طواف کیا کرتا تھا۔ دوست کے ملنے پر گلے
شکوہوں کا دفتر کھول بیٹھتا تھا۔ مگر کتنا فرق تھا حال کے فیجر شوکت ہیں اور ماضی
کے شوکت لغاری میں ۵

یہ مجھے معلوم تھا، دیا بدلتی ہے مگر،
تو بدل جائیگا یوں میں نے کبھی سوچا نہ تھا (خیال امر وہی)

ارشدملتانی

ۛ

سب اپنی طرح خوار ہوئے عشق میں ارشد

دلی کا ہو غالب کہ دلی ہو وہ دکن کا

غزل ساری مرتفع تھی۔ اکثر شعر بار بار پڑھو لئے گئے۔ مگر مقطع نے تو قیامت ڈھادی۔ بڑے بڑے بھادری شعر آگو دیکھا کہ بار بار مقطع پڑھنے کی فرمائش کر رہے ہیں اور سر ہلا رہے ہیں ”واہ اباہ سبحان اللہ کا درد جاری ہے اور ارشد صاحب آداب عرض ہے کہ تسلیمات عرض ہے بھٹک بھٹک کر کہے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ اس دن ارشد ملتانى نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔ یہ قصہ ہے ان دنوں کا جب کہ آتش ابلی جواں ہی ہوا تھا اور دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ شکل و صورت پڑھنے کے انداز اور دوا و دمول کرنے کے طریق سے دل میں خیال گزرا کہ ہونہ ہوا ارشد صاحب مرودنی شاعر ہیں یا ان کے آباؤ اجداد دلی کے روڑے تھے جو ملتان کی ژربائش و آرائش میں کام آگئے ہیں اور یہ مشاعرہ پڑھنے کا طور طریقہ ان کو درشت میں ملا ہے۔ مشاعرہ کے بعد نہایت گرجی سے ہاتھ ملایا۔ جی میں تھا کہ آئینہ ناب کو دوست بنائیں گے۔ عمر میں ایک سال ہی تو ہم سے بڑے نظر آتے ہیں۔ کالج میں فسٹ ایر یا سیکنڈ ایر میں پڑھتے

ہوں گے مگر کالج جا کر ان کی صورت نظر نہ آتی تو از خود گمان کر لیا کہ تعلیم مکمل کر کے کہیں جا چکے ہیں۔ پھر ایک دن اچانک اپنے استاد محترم محمد اجمل صاحب کو دیکھا کہ ارشد صاحب کے ساتھ لاکھ میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہیں استاد کا دوست ہمارا دوست کیونکر بن سکتا تھا یہ بھی معلوم ہوا کہ ارشد صاحب تو اندرون پاک گیٹ (مٹان) میں ڈپنٹری کھول رکھی ہے جہاں امام مریض ہی نہیں بلکہ ادب اپنے متعدد مریض ہیں قبلا مریض بھی شفا پاتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آنجناب نہ دہلوی ہیں نہ لکھنوی بلکہ اصلی، خالص اور کھرے ملتان ہیں اور شاہ غوث بہاد الحق کے اس شعر پر نازاں کہ

مٹان ما بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پابنہ کہ ٹکٹ سمجھ رہی کنسند

یہ اور بات ہے کہ مٹان والوں نے امیر خسرو جیسے فرشتہ صفت انسان کو بھی اس جنت میں زیادہ دیر ٹکٹ نہ دیا، آموں کا ٹکٹ بطور تحفظ ان کے سر پر رکھا اور کہا ”جمل“

من کہ بر سر نہ بہاد مگل
انہ بر سر کہ وہ دگشت ”جمل“

بھئی رنگت، کشادہ پیشانی، باریک ابرو، قدرے چھوٹی مگر چمکتی ہوئی آنکھیں بروہت غائب، دیش عتقا، ہونٹ کثرت پانی خوری اور سگریٹ نوشی کے باعث گلیچی کی بوٹی، دانت المیتہ سفید۔ ناک ستواں مگر درمیان سے موٹی۔ ایسی موٹی بھی نہیں جس پر انگشت لٹائی کی جاسکے۔ ناک پر ہر وقت عینک کا بوجھ اٹھائے

رکھتے ہیں مضمون یا مقالہ پڑھتے وقت عام طور پر سوٹ میں لمبوس ہوتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے چھوٹے بھائی نظر آتے ہیں۔ مشاعرے میں سینہ گھٹنایا تنگ موری کے پاجامہ کے ساتھ سیاہ شروانی زیب تن ہوتی ہے پاشوارہ آواز میں تحت اللفظ غزل پڑھتے ہیں۔ ترنم کے ذاتی طور پر خلاف ہیں اسے شاعری نہیں نے کاری اور گلے بازی کا نام دیتے ہیں ساقی کے قول کے مطابق چند بگنے چنے شعر آگے چھوڑ کر ترنم سے پڑھنے والے اکثر بیشتر شعرا کے کلام میں ایک چوتھا شعر ہوتا ہے اور میں چوتھا ہی ان کا گلہ۔ یہ لوگ پڑھنے میں عزت اور اداکاری سے مٹھک کیفیات پیدا کر کے لوگوں کو ہنسا تو لیتے ہیں مگر دلوں پر نقش نہیں جھل سکتے۔ ان کی شاعری کے ڈھول کا پول اس وقت کھتا ہے جب ان کی غزل صفحہ قرطاس پر آکر ان کا منہ چراتی سہمے اور فی الواقعہ ارتقا کے اس کلام میں کوئی کلام نہیں جھینٹ کر سنا ہے (ادہ۔ ہو۔ استغفر اللہ!) فان بہادر، ابوالاثر، فردوسی اسلام، پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق جسے صرف جاز کمال کر یا آسانی ایران، افغانستان بلکہ ترکی کا قومی ترانہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔

وزیر اعظم پاکستان نے ایک مرتبہ لاہور میں ان سے کہا تھا کہ وہ نئے پاکستان کا نیا قومی ترانہ لکھیں۔ خدا جانتے فردوسی اسلام فی شعر ایک درہم کے چکر میں یا نیا قومی ترانہ ایذا فرما رہے ہیں، ان کے کلام کو اجاڑنے اور سنوارنے میں قین چوتھا ہی حصہ ان کے نورانی اور گراوی وار گئے کا ہے۔ اگر گلہ نورانی نہ پایا ہوتا تو ان کی طرح ان کی شاعری بھی بحر ظلمات میں غوطے لگاتی۔ اب تو خیر ہے۔

مولانا بن گئے ہیں سے

عمر ساری تو کئی عشقِ بیاں میں مومن
سہری وقت میں کیا خاکِ مسلمان بونگے
مگر حفظِ جانِ دھری کے مولانا بننے میں حضرت مولانا ماہرِ نقادری کی طرح
کوئی بچتا و انہیں ہے سے

حسنِ والوں کے لطف و کرم دیکھ کر
سوچتا ہوں میں کیوں پارسا بن گیا

بہت بڑا فرق ہے مولانا حفظِ جانِ دھری اور مولانا ماہرِ نقادری میں۔ اول الذکر
سرکاری راجب خانے میں پٹنے والے گیمونٹ کافروں کو مسلمان بنانا چاہتے
ہیں اور مؤخر الذکر مسلمانوں کو کافر گردانتے ہیں بقول آفا شورش کا شمیری
آپ کی نگاہیں بہر حال وہ مومن یا مسلمان نہیں جتنا جو جماعتِ اسلامی میں
داخل نہیں یا اس پر ایمان بالغیب نہیں رکھتا۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے

جب ذکر چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تیری جوانی تک

آرشد صاحب سے مشاعروں اور بندہ اُکروں میں کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی
مگر یہ عام ملاقات ہوتی تھی وہ مقررین کی صف میں ہوتے اور ہم سامعین کی صف
میں کئی سال اس طرح بیت گئے تھے کہ جنوری ۱۹۷۵ء میں جب راجم الحروف
ان کی ایک سرانیکی غزل کی قصہ کے لئے ان کے پاس پہنچا تو قدر سے تفصیلی

ملاقات ہوئی۔ وہاں ان کے پاس ڈوائے دیوہول لینے والوں کے علاوہ جملہ
مریضوں کی بھی بھیر لگی تھی اور ہمارے آرٹ صاحب بیگ وقت تین زبالوں
سراٹکی، پنجابی اور اردو کے ڈاکٹر بنے مریضوں سے مصروف گفتگو تھے۔

جب میری باری آئی تو میں نے کہہ دیا: آپ دوسرے مریضوں سے
خارج ہو لیں۔ شکر یہ کہ دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور میں
ان کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ پہلے مشاعرے والی ملاقات کو دس بارہ سال
کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر آرٹ صاحب کی شکل و صورت میں زرا بھر بھی
تبدیلی نہ دیکھی سوائے اس کے کہ کینٹی کے چند بال سفید ہو گئے تھے۔ آرٹ
صاحب سنہ ۱۹۶۲ء میں عالم ارواح سے بزمِ وجود میں تشریف لائے۔ اس
لحاظ سے تو ان کے چہرے پر جھڑپوں کے نشان ہونے چاہئیں تھے اور
ان کو کمر پہاڑ رکھ کر اٹھنا چاہیے تھا، میں سوچ رہا تھا کہ عذابا نے
مرزا مسرٹ بیگ، پروفیسر قاضی کرنا لی اور آرٹ صاحب کے ہاتھ مصری
میتوں پر لگانے والا سالہ یا کوئی مجرب نسخہ آگیا ہے کہ عمر کے لحاظ سے
بوڑھے ہونے کے باوجود حقیقت میں نظر نہیں آتے۔ جب سے ہوش کی
آنکھ سنبھالی ان حضرات کو اسی طرح دیکھا۔

مرزا مسرٹ بیگ صاحب تہ سکول سے ترقی کر کے ملت کالج پانچ
پرنسپل بنے۔ ریٹائر ہو گئے مگر بارہ ماہی حج ابھی تو میں جوان ہوں۔ کہہ کر
ملت اکیڈمی کے پرنسپل بن بیٹھے۔ بورڈ کے دفتر سر اسے یا قلعہ کہنہ قاسم
باغ میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس تیز رفتاری سے دوڑتے ہیں کہ ہم نوجوان

روزیں ترسانس پھول جاسے ہم ذرا ساختہ مری ہوئی آواز میں السلام علیکم
کہتے ہیں اور وہ خالص گھی کے تڑکے کی طرح "علیکم السلام" کہہ کر یہ جا۔ وہ جا
ہم سے آگے نکل جاتے ہیں۔

کچھ بھی صورت احوال ہمارے ارشد طاقی صاحب کی ہے۔ "ہاں جی
اب آپ فرمائیں۔ میں اب فارغ ہوں۔" میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ
ارشد صاحب نے مریضوں سے فارغ ہو کر فرمایا۔ جب میں نے انہیں اپنا
"مرغ" بتایا تو مسکرائے فرمانے لگے۔ "میں تو آپ کو..... امرائن مخصوصہ کا
مرغ بھی تھا۔" میں نے رقمہ دیا اور ہم دونوں قہقہہ مار کر منہس پڑے۔

پہلی باقاعدہ ملاقات ڈیزہ گشتہ تک جاری رہی۔ نہ انہوں نے بزرگ
بننے کی کوشش کی نہ میں نے انہیں بزرگ مانا بلکہ اپنا گشتہ دوست سمجھ کر
وہ سوال بھی کر دیا جو میں مرزا مہرست بیگ اور پروفیسر عاقبی کرنا لی۔ سے کرنا
گستاخی سمجھتا تھا۔ یعنی وہی "اسا گن رہنے کا۔ کہنے لگے۔ "عزیز صاحب! ان
ہی بزرگوں کا کوئی "ادر مجرب نسخہ" ہاتھ آیا ہے اور نہ ہی میری صحت کسی معلوم
پہاڑ پر رہنے والے کسی بزرگ کی دعا کا کرشمہ۔ اچھی صحت قدرت کا عظیم ہے
اور اس کے لئے خدا کا شکر گزار ہوں۔" میں نے ان کا شعر دہرا کر پچھا کیا
آپ واقعی تیر اور دی کی طرح عشق میں خواہ ہوئے یا یہ صرف آپ کا شاعرانہ
چوچہ تھا۔ مسکرائے۔ کہنے لگے "عزیز صاحب! اس ذکر کو جانے بجھے۔"

ناکامی عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ جرابی

اس پہلی ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا اور نتیجتاً ارشد صاحب
اب ہمارے مستند اور بچے دوست ہیں۔

صبح ہر کہ شک آرد کافہ گرود

اور یہ ہیں ارشد طنائی جو آپ کو اپنی ڈسپنری میں ملیں گے۔ وہاں
نہ ہوں تو بابائے سرائیکی ڈاکٹر ہر عبدالحق کی میٹھک پر ملیں گے۔ وہاں ملاقات
نہ ہو سکے تو اخبار پر نظر دوڑائیے۔ کوئی محفل مشاعرہ، مجلس مذاکرہ اور کتاب کی
افتتاحی تقریب چھپی نظر نہ آئے تو دلی مسلم ہوٹل میں اقدار طاہر جھانک لیجئے
وہاں پائے کی چکی لگا کر شعر زیر لب گنگنائے ضرور مل جائیں گے۔

پروفیسر عاصی کرناالی

پروفیسر عاصی کرناالی کو جس نے سب سے پہلے گوٹنبرگ کالج سول لائنز مٹان کے ایک مشاعرے میں دیکھا اور سنا۔ سرخ و سفید رنگت، سر و قامت، ہلکی جسامت، کشادہ پیشانی، باریک ابرو، نیم دائی انگلیں جن سے ہر وقت مسکراہٹ جھانکتی رہتی ہے۔ ستواں ناگ، ہونٹ گلابی، سفید زانت، اکلیں خیلو، چال مع موج خرام یا ربی کیا گل کتر گئی۔ خود بھی حسین کلام بھی حسین۔

کالج کی مخلوق خدا کی پناہ۔ بڑے سے بڑے شاعر کو اڑالے پر آئیں تو کس میں یہ مجال کہ انہیں روک یا ٹوک سکے۔ مگر اس دن عاصی کرناالی کو بڑے ادب اور احترام سے منا گیا۔ عاصی صاحب نے آزاد نظم پڑھی تھی۔ میں نہ اس وقت اس حسن اظہار و در آمدی پودے سے متفق تھا نہ آج ہوں البتہ عاصی صاحب کے لب و لہجے، اور دشمنی دشمنی الفاظ کی فحاشی نے ان کا مداح بنا دیا۔ دل میں ایک ہلکا سا کاش یہ شخص بلیک بورڈ کی بجائے غزل کہے تو نادر تشبیہات اچھڑتے استعارات، بولتے ہوئے مہرے، چھکاتے ہوئے الفاظ سے سحر طرازیں کرے۔

حب راقم الحروف اپنی تعلیم مکمل کر کے تعلیمی بورڈ مٹان میں ڈاکٹر محمد اسلم چغتائی ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز کی مساعی جمیلہ سے کلر کی کئی عمدہ جمیلہ پرفائز ہو تو عاصی

صاحب گاہے بگاہے ملاقات ہونے لگی کبھی وہ ایوارڈز لے کر دفتر آتے اور کبھی کمیٹی آف کورسز کے اجلاس میں بطور کنوینر تشریف لاتے۔ مگر شعر و ادب پر کبھی گفتگو نہ ہو سکی بھلا ایک کلرک میں یہ پوتا یہ قابلیت کہاں کہ وہ کمیٹی آف کورسز کے کنوینر سے شعر و ادب پر بات چیت کر سکے۔ اگر قابل ہوتا تو کلرک کیوں بنتا؟

دفتر کے علاوہ اب بھی مشاعروں میں ملاقات ہوتی اور یہ دیکھ کر دلی خوشی ہوتی کہ انہوں نے بلینک ورس سے ہاتھ اٹھایا اور غزل کی قبو و قافیہ ردیف، بحر وغیرہ کے جوئے کو از خود اپنے گلے ڈال لیا۔ نتیجتاً ان کے ہم عصر مغربی شاعری کو گلے لگا کر، ابہام کے غار زار میں پھنستے چلے گئے لیکن عاقی صاحب کی شاعری نکھرتی اور سنو دتی چلی گئی۔ عاقی صاحب ترقی پسند ضرور ہیں مگر ان لوگوں میں سے نہیں جو ترقی پسندی اور جدیدیت کی آڑ میں روایات شعری کی قبر کھودتے ہیں، غریب کا ستھر اڑتے ہیں، عربانی کو حقیقت نگاری کا نام دیتے ہیں اور سمبلزم

شعری کی بدعت اور علامتوں کی دورا کار اور بعد از فہم موٹنگا فیاں کرتے ہیں قافیہ ردیف وزن اور بحر کو خیالات کے ابلاغ کے لئے سنگ گراں سمجھتے ہیں۔ برصغیر میں بیٹھ کر ماسکو، امریکہ، لندن، پیرس کی شعری روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ جدید ترقی پسند شاعری کے امام جوش، فیض، انیم داسشد اور ظہیر کاظمیری وغیرہ نے شعری تجربات کی عمارتیں ملکی روایات کی زمین پر تعمیر کی ہیں مگر ان کے منتقدین نے ابہام، علامات اور نفسیاتی تجزیے کے

پھاڑ سے لے کر ان عمارات کو بھی مسمار کر دیا ہے۔ عوام کا تو کیا مذکورہ اگرچہ
یہ شعر خود کو عوامی کہتے ہیں، خواص بھی ان کی چیتاں تراکیب کو سمجھنے سے
عاجز ہیں۔ درد کا چاند، زہر و قہار، دکھ کا ساگر، شکست آہنگِ حوت و معنی اور
دہریے عناصر کے معنی آپ کسی ڈکشنری میں نہیں پائیں گے "الایہ ترقی پسند"
اپنی نظم آزاد میں استعمال کردہ ان معنیٰ تراکیب کی خود تشریح نہ کریں۔
یہی وجہ ہے کہ عاصی صاحب بہت جلد ان سے الگ ہو کر اپنی شاہراہ
پر چل سکے اور آج ان خود ساختہ ترقی پسند شعرا سے کوسوں آگے نظر
آتے ہیں جبکہ وہ اپنی ابہام گئی کے دلدل میں ایسے پھنسے ہیں کہ دن
بدن قعر گنہامی میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔

عزیزانِ محترم کا مسودہ تیار ہو چکا تو زبانِ دیبا کی افلاطون درست کرانے
کے لئے قمر علی عاصی کرنا لی کے نام چڑا۔ برادرِ حمید بشا لوی ان کو پڑھانے
کے لئے لے گئے۔ میں ان کے ساتھ نہ تھا۔ انہوں نے انتہائی معروضیت
کے باوجود نہ صرف زبانِ دیبا کی افلاطون درست کر دیں بلکہ اپنے قیمتی اور
"چنگے" مشوروں کی دولت سے بھی مالا مال کیا۔

عاصی صاحب ۱۹۶۷ء میں کرناں میں پیدا ہوئے اس لحاظ سے انہیں
ہمارا بزرگ ہونا چاہئے تھا مگر جب بزرگی کے آثار ہی نظر نہ آئیں تو ہم انہیں
کیونکر بزرگ تسلیم کریں۔ وہی دس بارہ سال قبل والا نقشِ جہانے بیٹھے ہیں
دھان، پان، نازک اندام و نازک خوام ہونے کے ۔۔۔ باوجود آدمی
درجن بچوں کا بوجھ اپنے نازاں کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور اُٹ

تک نہیں کرتے۔ ان کا بڑا خاصا جزاء ہم سے کوئی دو چار سال ہی چھوٹا ہو گا مگر آج
خانہ دانی منصوبہ بندی والوں کا منہ چڑا کر بچے کبھی ایزاؤ فرما رہے ہیں اور غزلیں
بھی یعنی مادی اولاد بھی بڑھ رہی ہے روحانی اولاد بھی۔ ان کا پہلا مجبوزہ کلام
”رگب جاں“ مکتبہ السانیت والوں نے چھاپا۔ اور دوسرا جشن خزاں“ آئینہ ادب
لاہور والوں نے۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ پہلی نظم جب مکھی ترنوں
جماعت میں پڑھتے تھے یہ نظم مسلم لیگ سے متعلق تھی اور مولانا ظفر علی خاں
مرحوم نے اسے زمیندار کے صفحہ اول پر چھاپا۔ شاعری میں تمیز الرحمن ہیں ایک
آدھ غزل استاد احسان دانش صاحب کو بھی دکھائی مگر باقاعدہ شاگرد کسی کے
نہیں بقول ان کے زمانہ ان کا استاد ہے البتہ تحفہ الفاظ اور بندش وغیرہ کے
سلسلے میں اپنے سے کمتر سخنور اور سخن شناس لوگوں سے بھی مشورہ کرنے میں
حاذ نہیں سمجھتے۔ قریب میں تمیز غالب اور اقبال اور ہم عصر شاعر ہیں احمد ندیم قاسمی
احسان دانش اور عبدالعزیز قالد کی شاعری کے معترف ہیں۔ اقبال کو اس صدی
کا سب سے بڑا الہامی شاعر مانتے ہیں اور انکا یہ شعر انہیں دل و جان سے پسند ہے
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سنے ہیں تقدیر کے چاک
ہمیشہ تحت اللفظ غزل پڑھتے ہیں اور ترنم کو ”لے کاری“ اور ”گئے بازی“
گردانتے ہیں۔

شوق ہے اپنی طرح کے نفیس ایڈیشن کتابوں کے جمع کرنے کا اور نالوں ہیں
گرانی کے ہاتھوں جس نے رونی کپڑے اور مکان کے چکر میں ایسا جکڑ دیا ہے
کہ اچھی کتابوں کا سیٹ خریدنا تو رہا ایک طرف صرف ایک اچھی ہی کتاب بھی

خریدنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا ہے مثلاً عبد العزیز فاقد کی کتابوں کی سیٹ
چرا یا تو جاسکتا ہے مگر خریدنا نہیں جاسکتا الا عبد العزیز فاقد مثلاً ظرف قدح خولہ
دیکھ کر تحفہ عطا فرماؤں ص سنا ہاں را چہ محجب گر بنوا زندگد ارا
ہمارے عاقبتی گرنالی صاحب بھی بہت معروف زندگی گزارتے ہیں کالج
کے گھر اور گھر سے ملت اکیڈمی وہاں سے ایوان ملتان۔ ایوان ملتان سے ریڈیو این
یا پھر ملت اکیڈمی سے اٹھ کر کسی مجلس مذاکرہ کی صدارت فرماتے ہو گئے یا کسی
مشاعرہ میں نرم نرم الفاظ، مسیحی مسیحی آوازیں، لوح واد آواز بیاں، کنوارے
کنوارے لہجے کہ جس سے انکا منہ چومنے کو جی چاہے اور آنکھوں اور کشادہ پیشانی
پر کھلتی اور کھلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی یہ دل نشیں غزل پڑھ رہے ہوں گے۔

تیرے جلوؤں کا ہجوم اور کدھر جائے گا
یہ گلستان تو میرے دل میں اتر جائے گا
میں دعا گو ہوں سلامت ہے یہ رنگِ جلال
رنگ پھر رنگ ہے اک روز بکھر جائے گا
ماد و مرغ سے انسان کو گزر جانے دو
جب یہ لوٹے گا تو فاروں میں اتر جائے گا
زندگی فصل بہاراں کی طرح بے گی فریب
آدمی پھول کی مانند بکھر جائے گا
تو میرے سینہ بیتاب پہ یوں ہاتھ نہ رکھ
دل اگر زور سے دھڑکا تو ٹھہر جائے گا

ابھی اگلی شہر افست کے نمونے پائے جاتے ہیں

بزرگان محترم

گرفرق مراتب نہ کنی زندیقی

و کتاب اللہ کی بلا منت کے صلے سے جاسے۔ خود
بولتی ہے کہ میں نے تمہاری نئی ہوں۔ بابو! اس کی قمیص دکھایا کرو
اسے بٹھا کر دیکھو اور خواہ اسماعیل غمبڈ کی طرح وہ بھی
اقبال کی طرح — دیکھا اس نے قرآن کو قرآن میں ٹپ
کر چھا تو مغرب کی دانش پر ہل بول دیا۔ وہ تمہارے بگدوس میں
اللہ اکبر کی صدا تھا۔

رامیر شریعت

لیکے لارڈو کا مجنوں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

مت سہل ہیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پڑے سے اسان ٹھکتے ہیں

تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے کہ ایک دن پروفیسر ریاض زیدی صاحب نے
بتایا کہ آج چار بجے گورنمنٹ کالج سول لائٹنریس ڈاکٹر سید عبداللہ کا لیکچر ہے
آپ لوگ ضرور بروقت پہنچیں۔ ڈاکٹر ڈل کے ہوں یا زبان (Language)
کے باتیں خشک ہی کرتے ہیں مگر ڈاکٹر سید عبداللہ میں یہ بات نہیں ہے۔
ان کا لیکچر اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ قاری چاہتا ہے ج
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

زیدی صاحب نے اردو زبان کی چٹیک دل میں پیدا کر دی تھی۔
سید صاحب کا لیکچر سننے کے لئے وہاں پہنچے تو سامعین کی صفوں کو مغلس
کی متیلی کی طرح خالی اور مقررین کی جگہ کو ہاؤس فلٹ پایا۔ یہ بات مقررین
کے لئے جو اپنی بغلوں میں داستان امیر حمزہ کی ضخامت کے مقالات

وہ اپنے ہونے تھے۔ جو صلہ شکن ممتی گروہ ہارمانے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے سامعین کا انتظار کرنے کی بجائے اپنی ہی صف کے لوگوں کو ڈاکٹر صاحب پر لکھے ہوئے مقالات سنانا شروع کر دیے، جنہوں نے مختلف تھے مگر آخری تان اس پر آن کر ٹوٹتی تھی کہ وہ سید صاحب کے بہت بڑے معتقد یا شاگرد ہیں اور سید صاحب کا کلاس لیکچر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اور دلچسپ اس لئے ہوتا تھا کہ سید صاحب لطیفے بہت سنایا کرتے تھے۔ جب سید صاحب کی باری آئی تو سامعین کی صفیں بھی بھر چکی تھیں تالیوں کی گونج میں ڈانس پر تشریف لائے۔ گوری چٹی رنگت، لانا قد، کلین شیو، سر پر جناح کیپ ہلکے سلیٹی رنگ کا سوٹ زیب بدن اور آلہ مکبر الصوت وائیں کان میں لگائے ہوئے تھے۔ دھیمے دھیمے میں تقریر شروع کی۔ ابتداً تمام مقررین کا نوٹس لیا اور فرمایا: ان فاضل مقررین حضرات کے پُر مغز مقالات سے تو صرف ایک بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر کلاس لیکچر بہت دلچسپ ہوتا تھا اور دلچسپی کی وجہ وہ لطائف تھے جو میں دورانِ لیکچر سنایا کرتا تھا۔ ہر استاد کا اپنا طریق تدریس ہوتا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ میرے شاگردوں کو کسی قسم کی تشنگی محسوس نہ ہو۔ ادب کی تاریخ اور تنقید کی خشکی کو چشکیوں اور لطیفوں کی خشکی سے خوشگوار بناتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میرے ان شاگردوں اور معتقدوں کو میرے لیکچر یاد نہ رہے صرف لطیفے ہی یاد رہ گئے۔

اس دن سید صاحب کے لیکچر کا موضوع غائبانہ روزِ بان کا فروغ تھا۔

اردو کی زبان کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں ایک مشورہ یہ دیا کہ علاقائی زبانوں کو اردو کا مقابلہ دیکھنا چاہیے اور نہ ہی انہیں درمقابلہ جانا چاہیے بلکہ ہر علاقائی زبان کے عام فہم الفاظ کو شامل کرنا چاہئیں تاکہ اردو جامع ہو کر رہ جائے۔

یلائے اردو کے مجنوں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ سے یہ میرا باقاعدہ تعارف تھا۔ اس سے پیشتر میں نے ہفت روزہ چٹان لاہور میں ان کے چند مضامین پڑھے تھے اس کے بعد ہی اسے میں طیف نثر اور طیف غزل نظر سے گذریں جو سید صاحب کے کلاس لیکچروں کا مجموعہ ہیں۔ ان کے مرتب جناب ممتاز حلقوری نے اپنے طور پر بہت محنت اور کاوش سے تیار کئے ہیں۔ ان لیکچروں میں سید صاحب کا رنگ پور سے طور پر واضح تو نہیں بھر بھی مواد اور اشارات کے لحاظ سے غلطی کی چیز ہیں۔

میر اور اقبال سے سید صاحب کو عشق ہے طیف اقبال اور نقد میر ان کے عشق پر دال ہے۔ میر اپنے منصب نہیں کہ ان کی طرز تحریر پر کوئی رائے لانی کروں البتہ یہ بات کہے بغیر وہ نہیں سکتا کہ ان کی نثر میں عالی اور بلایے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی سادگی پائی جاتی ہے لیکن یہ سادگی بے طعف اور سہل نہیں اس میں طنز کی منگی اور مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ سید صاحب مقالہ نگار کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک بلند مرتبہ نقاد بھی ہیں۔ مگر کلیم الدین احمد کی طرح ہاتھ میں دو دھاری تلوار لے کر ہر سامنے آنے والے کو شہید کر کے خود مرد فازی نہیں جتے۔ محمد حسین آزاد کی مانند اپنے

ممدوح کے وجود کو بلند بالاثابت کرنے کے لئے اُس کے مد مقابل پر خاک نہیں اڑاتے۔ ثنائی زلزلہ کو نہ پا ہی زلزلہ ثابت کرنے کے لئے اس کے ہاتھ سے اسٹراے کو توار نہیں بھاتے اور نہ ہی کراچی کے حاجی بنگلواں نقار کی طرح تنقید کرتے ہیں کہ قادی کو تنقید کا سرا نہیں ملتا اور وہ تحریر کے الجھاؤ میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ سید صاحب شاعر و شکر نگار پر تنقید کرتے ہیں تو اس کی تخلیق کے معائب و محاسن دونوں کو سامنے لاتے ہیں۔ اس کے ماحول، حالات اور واقعات پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں جس سے ایک ہمدردانہ نکتہ نظر وجود میں آتا ہے اور اسی ہمدردانہ نکتہ نظر کی ہماری تنقید میں کمی ہے۔ ایک زمانے میں سید صاحب کو یہ جنوں ہوا کہ مالی روڈ کی دکانوں کے تمام بورڈ اردو میں لکھے ہونے چاہئیں پھر کیا تھا چند یو ایف او کو ساتھ لیا اور چل کھڑے ہوئے۔ تاجروں اور دکانداروں نے ان کی معروفیات سنیں تو کچھ وقت کے لئے جاگ اُٹھے۔ اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر بورڈ اردو میں لکھوا دیئے۔ سید صاحب بھی خوش ہو گئے۔ جیسے پوری قوم نے فرنگی کو طلاقی دے کر اردو بالوں کو اپنا لیا ہو۔ ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تاجروں نے ایک ڈیڑھ ماہ بعد اردو بالوں کی سوکن فرنگی کو ملا لے کر بغیر پھر سر پر لا بٹھایا اور ہمارے سید صاحب پر تماشا دیکھتے رہ گئے۔ قوم کے بارے میں جو غلط فہمی یا خوش فہمی اقبال کو ملتی کہ

عذر الہم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
وہی غلط فہمی یا خوش فہمی سید صاحب کو بھی ملتی حالانکہ برصغیر کے مسلمانوں کو خواب

غفلت سے بگائے کیلئے جتنے بازی آئے آخر میں بالوں ہی گئے۔ ان میں سید صاحب کا مدوح امام عشق جنوں — ابوالکلام بھی تھا جس کے دیگانے کا انداز سب سے جدا تھا۔ اس کی دہز خوانی ملاحظہ ہو۔

آہ تہاری غفلت سے بڑھ کر اچنبھے کی کوئی بات نہ ہوئی اور تمہاری غفلت کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ آہ تم ایسے نہ بنے۔ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتنا دواؤں اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں طپٹ آئیں اور تمہاری غفلت مرجائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ غلط ہیں تم کیوں اپنے آپ کو بلا کر رہے ہو اور کسوں تمہاری غفلتوں پر طعناں چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور بھتے ہو اور نہ تو راستبازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے۔ اور نہ گمراہیوں کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔

پتا خراباں والے ابوالکلام نے بھی ارمان ملی اور کہا کہ میں اس عہد اور اس زمانے کے لائق نہ تھا اور بڑے اور چڑیا غبار خاطر۔ جسے سید صاحب ابوالکلام کے نصف و اعطاط کی یادگار رکھتے ہیں کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔

اکثر سید عبداللہ کے مدوح کی طرح راقم الحروف کے مدوح امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بھی قوم کے آگے تھیار ڈالنے پڑے شاہ جی جیسا ترکان خوان، لسان اودیا حرم راہ صلح حدیث میں پیدا ہوتا ہے مگر تین سو سالہ غلامی نے ذہن ہی رنگ اکود کر دئے ان کی باتوں پر کون کون بھرتا

چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجیب نہ تھا کہ انکی
 شگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہکلام ہوتا تو جھوم اُٹھتے۔ چٹانوں
 کو جھنجھوڑتا تو چٹنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان
 بلند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ روڑے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو لیمک
 کہہ اُٹھتیں۔ مرنے سے کہتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں
 بڑے بڑے جھگڑاؤں پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ محرابیں ہلنے لگتے۔ لیکن
 میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا۔ جن کی زمینیں بھری ہوئی ہیں۔ جن کے ہاں دل
 دو باغ کی کمی ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آچکے ہیں۔ جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں
 جن کی بیتیاں انتہائی خطرناک ہیں۔ جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گند
 جانا خطرناک ہے۔ جن کے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔“

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ سید صاحب ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ
 ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے ان کی خدمات تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔
 اردو کے ہر پرستار کے دل میں ان کے لئے ادب و احترام پایا جاتا ہے
 مگر حکومتی سطح پر مولانا غلام رسول ہرمجوم کی مانند ان سے کوئی اجتماعی اور
 قومی کام نہیں لیا جا رہا۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کا پرو سگینڈہ بہت ہے
 مگر قدم توہیں کی وجہ سے کام بہت کم ہو رہا ہے اور پھر سید صاحب عمر کی
 اس سترل پر ہیں۔ جہاں شوق باریہ پیمانی تو ہوتا ہے مگر قوت باریہ پیمانی
 نہیں۔ ان کا حوصلہ ہے یا اقبال کا عشق کہ آج کل ہفت روزہ چٹان میں
 اقبال اور غلام اقبال پر گواہی سے مقالے پھر نظم کر رہے ہیں اور

بے توفیق دانشدوں اور خود ساختہ مفکرینِ اقبال کا منہ پڑا ہے ہیں۔
ہے با ایں ہمہ نصف دانا قرانی
و اتی! چہ کار مانہ کر دیم

”زندگی ہی کیا ہے: تیرے چوتھائی چل میں کٹ گئی
ایک چوتھائی ریل میں تھنے وڑنے میں سے بہرہ رکھ لوگ ملے کا
ہار بننے گئے۔ آج کل کے مل ڈھاکر ڈھاکے لکھنؤ، لکھنؤ سے
بمبئی پھر آگوا، آگوا سے دہلی، دہلی سے لاہور، لاہور سے پشاور
پشاور سے کراچی۔ سال کے تین سو بیسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ
تغریروں کی ہو گئی۔ میں نے تقریر کیا، لوگوں نے کہا: ”وہ شاہ
جی: شاہ“ میں قید ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: ”کہ شاہ جی: شاہ“
وہ۔ کہہ میں ہم نے تباہ۔“

راہیہ شریعت

علامہ غلام شبیر بخاری

خواجہ برکت اللہ انصاری نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ بچہ
 چلے سے خوشی داڑھی والے، سفید قمیض اور پاجامہ زیب تن کئے، سر پر
 ٹوپی سجائے، آنکھوں پر عینک چڑھائے، کمرے کی درمیان کی کرسی
 پر جو صاحب بیٹھے لکھنے میں مصروف ہیں وہی علامہ غلام شبیر بخاری ڈائریکٹر
 ایجوکیشن تھان ہیں۔ میرا سر جکرائے لگا کر یا اللہ ایسے ہوتے ہیں علامہ
 ان سے پہلے میں نے دو چار علامہ دیکھے تھے۔ حضرت قبلہ علامہ تاج محمد سعید شاہ
 صاحب کاظمی مدظلہ، حضرت علامہ دوست محمد صاحب قریشی مرحوم، حضرت
 علامہ سید محمد یوسف جوڑی دامت برکاتہم وغیرہ مگر علامہ غلام شبیر بخاری کے
 سر پر نہ دستار فضیلت تھی نہ ان کا قبہ شکم گنبدِ فلک کی مہری کا دھوسے دار تھا۔
 علامہ صاحب فی الواقع اردو علم و ادب کے علامہ فہامہ میں علوم اسلامیہ
 پرورد خور دانی رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کو ان کے دوستانہ
 لگہ ہے کہ وہ اردو ادب کو مسلمان بنانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں ان کا
 بس نہیں چلتا ورنہ اردو پر عربی کا خول چڑھا دیں۔ ان حکایت / لگہ گفتگو
 میں اُفکد پریشان مئے خالق جہنم ایم۔ آر۔ کیانی مرحوم سر فہرست ہیں۔
 میں نے پوچھا یہ اکادمی کیا جلا ہے؟ شبیر بخاری کو بھی احساس تھا کہ

یہ لفظ میری بساط سے باہر ہے۔ انہوں نے مہربانی فرما کر توضیح کی کہ یہ انگریزی لفظ اکیڈمی کی تعریف ہے۔ اب اگر تعریف کا لفظ اکادمی سے کم ثقیل ہو تو آپ مجھے جو چاہیں سزا دیں۔ تعریف سے مطلب عربی میں ڈھانسا ہے مگر میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ تعریف ہے یا تفریس۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ اکادمی ہے کیا چیز؟ اس پر بخاری صاحب نے دستور العمل کی ایک نقل دی جس دفعہ ایک میں لکھا ہے کہ اردو زبان کے تحفظ و تحقیق و فروغ و اشاعت کا نام ہے۔ اردو اکادمی۔ یہ دستور العمل پڑھ کر تو میں سر سے پاؤں تک متعجب ہو گیا اور جسم سے عربی ٹپکنے لگی۔

علامہ صاحب عام طور پر ہر سائل کو پورے طور پر مطمئن کر دیتے ہیں ان سے مل کر جی خوش ہوتا ہے کہ علم و ادب کے ایک چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا سے ملاقات کی ہے۔

بہت جی لگتا ہے صحبت میں ان کی وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں مگر بوقت ملاقات کوئی اپنی ملیت / ڈگری کا جعلی عکس ڈالنے کی کوشش کرے تو پھر علامہ صاحب سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اچھا اچھا آپ ایم۔ اے عربی اور ایم۔ اے اسلامیات ہیں۔ ماشاء اللہ! اخبار الشریعہ تو فرمائیں کہ صحاح ستہ سے کون کون سی کتب حدیث مراد ہیں؟ دعائے قنوت تو آپ کو یاد ہوگی۔ ذرا وہ تو سنائیں۔ پانچواں کلمہ کون سا ہے؟

بھلا ہم روایتی اور موروثی مسلمانوں سے ایسے سوالات کرنا علامہ صاحب

کی زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟ میرا در غالب کے ایک نام نہاد پرستار سے انٹرویو کے دوران اچانک رمیں المستقر میں جگر مراد آبادی کا اصل نام پوچھ بیٹھے۔ اُسے اصغر گرنڈوی کا کوئی شعر سنانے کو کہا۔ جوشش کا اصل وطن پوچھ بیٹھے۔ اس کا مبلغ علم گٹ پتھر دگائی میں تھیں۔ وہ ہچامہ اس اچانک حملہ ترکا نہ سے سم گیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

علامہ صاحب آج کے ہر طالب علم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی طرح علم کا سمندر ہوگا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ دور کے نت نئے نظام سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ کوئی شاہین بچہ پیدا کرے گی۔ ان کا دور سیاسی غلامی کے باوجود علمی اور ادبی لحاظ سے عروج کا دور تھا۔ اسی دور میں سبکی، سرسید اور علامہ میر حسن جیسے استاد ابھرے جنہوں نے اپنے پیچھے سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر جانشین چھوڑے آج نہ ویسے استاد ہیں نہ شاگرد۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ نتیجتاً ہم ذہنی فلاس میں افسوسناک حد تک مبتلا ہیں اور ہماری علمی قابلیت کو باوجود بلند پایگانہ وعادی کے کوڑھ لگ چکا ہے۔

علامہ صاحب نے اتنی شیردانیائی نہیں بدلیں جتنے عہدے بٹے ہیں اور اتنے عہدے نہیں بدلے جتنی جگہیں / مقامات بدلے ہیں۔ آج بہاولپور میں ہیں تو کل لاہور میں۔ پارسوں اسلام آباد اور اترسوں ملتان۔ گویا کہہ سکتے ہیں کہ

ح ایک چکر ہے میرے پاؤں میں تو نہیں

دقوس اس بات کا ہے کہ علامہ صاحب جیسے نابغہ ماہر تعلیم سے
کوئی قومی قاعدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ ڈائریکٹر ایجوکیشن کا عہدہ ان کی علمی
کامیابی سے فروتنہ آتا ہے۔ اور پھر ڈائریکٹر ایجوکیشن عثمان کا عہدہ پھول
کی بجائے تھول کا بنر ہے۔

• مطبوعہ ہفت روزہ اذانِ عثمان •

جنوری ۱۹۵۰ء

پروفیسر میاں سعید اختر مرحوم

تیری یاد باقی تیرا قسم عظمت
بسکتا نہیں کسی تجسین میں

پروفیسر میاں سعید اختر کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا پتہ ہے دل کا پتہ ہے
ان میاں قابل استاد، ان جیسا پیارا استاذ امدان جیسا عظیم انسان میری نظر
سے نہیں گزرا۔ بحیثیت ایک قابل استاد ان کی قابلیت کا ادنیٰ ثبوت یہ تھا
کہ بروغیر کے مشہور ترقی پسند شاعر اور ماورائے کے مصنف جناب ن۔ م۔ راشد
کے چھوٹے بھائی پروفیسر رفیع۔ م۔ ماجد کے استاد تھے۔ استاد کو اپنے بہنہار
شاگرد پر فخر تھا اور شاگرد اپنے استاد پر نازاں تھا۔ راجہ صاحب جب ملتان
بورڈ کے چیئرمین بنے تو میاں صاحب کو بااصرار حیدر آباد سے ملتان سے
آئے اور میاں صاحب کنٹرول امتحانات کے عہدہ پر نائز ہوئے۔

چند ہی دنوں میں انہوں نے اپنی ذاتی وجاہت و شرافت، بلند اخلاق
اور مریانہ سلوک کی بنا پر دفتر کے ہر چھوٹے بڑے اہلکار کے دل میں گھر کر لیا۔
سٹاف میں ان کی حیثیت ایک آفیسر کی نہیں بلکہ ایک شفیق باپ اور
بہادر بڑے بھائی کی تھی وہ ہر خوشی اور غمی میں ہر کسی کے ساتھ ایک نود خانگی

میاں صاحب ہر رڈ کے دیرانہ آباد میں واحد آفیسر تھے جن کی زبانِ قلم سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچی وہ نہ بلند منصب کی کرسی پر بیٹھ کر ٹھے بڑے عزت نگاہ و نگ بھی بھگت جلتے ہیں اور اپنے ماتحتوں کے لئے انار بکس کر دے اعلیٰ کی

تصویر مجسم بن جاتے ہیں۔ اقتدار کے ساتھ خوف خدا صرف چند خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم مرتبہ آفیسر تڑپے ایک طرف، چپڑاسیوں کو بھی یہ آپ کہہ کر مخاطب ہوتے غلطی پر سرزنش ضرور کرتے۔ لیکن یہ سرزنش ایک آفیسر کی جھانڈ نہ ہوتی بلکہ ایک شفیق اور سہروردی سے بھائی کی تنبیہ ہوتی بعض دفعہ دفتری غلطی پر اس انداز سے سرزنش کرتے کہ غلطی کرنے والا اپنے کئے پر خود نادم ہوتا۔ ایک دن راقم التحریر چند T.A. Bhatti تصدیق کراتے کیلئے ان کے دفتر گیا۔ چھٹی کا وقت قریب تھا۔ کام میں مصروف تھے فرمایا بھائی انہیں میرے (Rack) میں رکھ دو۔ ڈاک سے فارغ ہو کر یہ کام کر دیں گا؟ چنانچہ وہ بل دیں چھوڑ کر اپنی برائچ میں چلا آیا۔ دوسرے دن میاں صاحب کے پاس جلسے کے لئے پُر تولی رہا تھا کہ ان کا چپڑاسی وہ بل لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ بل اس حالت میں نہیں تھے جس حالت میں میں انہیں چھوڑ آیا تھا بلکہ ایک فائل کوڑ میں پلٹے اور تیلیپر سے بندھے ہوئے تھے۔ میری غلطی تھی کہ انہیں فائل کوڑ میں پلٹنے کی بجائے کمر باندھی کھلا چھوڑ آیا تھا فائلوں کے انبار میں ان میں سے کسی ایک آدھ کے گم ہو جانے یا آدھ بھر ہو جانے کا توئی نامکان تھا۔ کوئی اور آفیسر ہوتا تو اپنے کمرے میں بلا کر دس آدمیوں کی موجودگی میں بھاڑتا، کوئی با اختیار ہوتا تو میری غلطی پر وضاحت طلبی کر کے اپنے بڑا اختیار ہونے کا ثبوت دیتا مگر میاں صاحب مرحوم نے جس طریقے سے غلطی کا احساس دلایا اور اصلاح فرمائی وہ صرف انہیں کا حصہ تھا۔

بورڈ کے نگار خانے میں ہمارے دوست ظفر احمد ایک ناظر موجود تھے ہیں

پانچ کا ہر کام خود کرتے ہیں کسی دوسرے کو حتی الامکان شریک نہیں بننے دیتے
 وجہ یہ ہے کہ کھجناپ کو کسی دوسرے کا کیا ہوا کام کسی دوسرے کی غصی ہوئی
 ضرور اور فٹ پستہ ہی نہیں آتا۔ ہوشیار پور کے درباری گائیڈک —
 ہوشیار پوری نم لاہوری ثم طانی کی طرح ہر شخص اور ہر کام میں میں منہ ٹھکانا، انہوں
 نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے اگر کوئی (colleague) کہے کہ یہ کام آج
 کرنا ہے تو کہیں گے کہ یہ ضروری نہیں کل کریں گے۔ اور اگر کوئی کہے کہ یہ کام
 گل کریں گے تو اسے نکھٹا، نا اہل اور کام چور کے القاب سے نوازا کر وہ کام اسی
 دن کریں گے چاہے دفتر کا نام ختم ہی ہو گیا ہو۔ کام کرنے کے باوجود حکام
 بالا کے سامنے جانے سے بہت کتراتے ہیں گرمیاں صاحب کے سامنے
 جانے کے لئے بہانے تراشتے اور کہتے کہ میاں صاحب کو سلام کروں تو محسوس
 ہوتا ہے کہ آج میں نے کوئی نیکی کی ہے اُن سے مل کر آؤں تو میرا جہان
 کہتا ہے کہ آج تو ایک عظیم انسان سے مل کر آیا ہے۔

ایک دن دو بکے انہیں خیال آیا کہ اپنیل امتحانی مراکز کی منظوری کنٹرول
 صاحب سے کچھ ہی لینا چاہئے۔ میں نے کہا: ظفر صاحب دفتر نام ختم
 ہو گیا۔ آج سارا دن کام کیا ہے۔ وقت کے وقت چل کر آرام کرنا چاہیے
 میاں صاحب اب گھر جا چکے ہوں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ میاں صاحب
 ان آفیسروں میں سے نہیں جو دفتر نام تو صرف دوستوں کو فون کر کے، ملاقاتیں
 کرنے اور چائے سگریٹ پینے پلانے میں گزار دیتے ہیں اور دفتر نام کے بعد
 فائلوں کے انبار اپنی میزوں پر بجا کر دربار لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھجناپ

پڑ گئے۔ منظوری آج ہی لینا ہوگی۔ میں میاں صاحب کے گھر خود جا کر منظوری
 لے آؤں گا۔ تم سنٹر اسسٹنٹ منجھا لو اور مجھے تعداد بتاتے جاؤ۔ میں سپر انڈر
 ہو گیا۔ جب کام سے فارغ ہوئے تو تین بج رہے تھے۔ ظفر صاحب نے
 سائیکل اٹھایا اور کڑکٹی چلتی دھوپ میں میاں صاحب کی کوکھی پر جا پہنچے
 وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے گھنٹی کی آواز سن کر خود باہر تشریف لائے کوئی
 کم ظرف آفیسر ہوتا تو دھاڑتا۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ گھر پر بھی آرام نہیں کرنے
 دیتے وغیرہ وغیرہ مگر میاں صاحب آفیسر نہیں ایک عظیم انسان تھے۔ اور
 ہمارے ملک میں یہ ضروری نہیں کہ ہر آفیسر ایک عظیم انسان بھی ہو۔ ظفر صاحب
 کو پینے میں شرابورد دیکھا تو کوکھی کے اندر چکھے کے نیچے جا بٹھایا۔ دوسرے
 کمرے میں گئے اور شربت روح افزا کا جگ بھر لائے۔ سر آپ نے مجھے
 شرمندہ کیا۔ میرے لئے خواہ مخواہ تکلیف..... یہ نہیں بھائی اس میں
 شرمندگی کیسی اور تکلیف کا کیا مذکور۔ لو شربت پو۔ آپ دھوپ میں چل کر
 آئے ہیں۔ میاں صاحب نے ظفر کی بات ہی اچک لی اور شربت کا گلاس
 بھر کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ریاض صاحب یا رانا شریف صاحب کا
 گھر ہوتا اور وہ گرمیوں میں بھی چائے پر تو غلنے کی بجائے شربت کا جگ
 سامنے لائے تو ظفر صاحب بلا تکلف، افسری ماتحتی کے فرق کو بھٹکتے ٹٹاتی
 دیکھتے ہوئے جگ کو ہی منہ لگا لیتے یہ میاں صاحب کے احترام کا اثر تھا
 تو ایک گلاس پر اکتفا کیا۔ مگر میاں صاحب کب مانتے تھے دوسرا گلاس
 بھر کر ہاتھ میں تھما دیا۔ خال دیکھی دستخط کر رہے اور ظفر صاحب، پس آگئے ایسے

کئی واقعات ہیں جن سے میاں صاحب کی فاضلانی بنیابت و شرافت نکلتی ہے مگر طوالت کے خیال سے چھوڑ رہا ہوں۔

راجہ فہم۔ صاحب جب ملک ستان پور میں رہے میاں صاحب کی زندگی پر سکون رہی راجہ صاحب فی الواقعہ ناہنہ شخصیت (genius) تھے اور ہر ناہنہ شخصیت اپنی انانیت کی سدرۃ المنتہی پر ہوتی ہے۔ مگر وہ میاں صاحب کا احترام اس طرح کرتے جس طرح ایک پرائمری سکول کا بچہ اپنے استاد کا احترام کرتا ہے۔

عج گہر حفظ مراتب نہ کئی زندگی

راجہ صاحب پر ۲۰۳ کی تلوار چلی تو میاں صاحب پر بھی اس اتبلا کا اثر ہوا۔ ایک صاحب بہادر تشریف لائے جو پست قامتی کے ساتھ پست ذہن بھی تھے۔ ان کا چہرہ ان کے دل کی آئینہ داری کرتا تھا۔ ایک سابق وزیر اعلیٰ کی شاہ بخشوں کے طفیل، اپنے سے سینئر لوگوں کا منہ چرما کر اس عہدہ پر پہنچے۔ واحد خوبی یہ تھی کہ رنجیت اور رنجیتی میں ماورزا دگایاں دے لیتے تھے۔ ان لوگوں کے ضمیر پر رونا آتا ہے جو اس کے دربار میں باجماعت گایاں کھاتے مگر اس بد لگام کورو کئے یا تو۔ کئے کا حوصلہ نہ رکھتے۔ میاں صاحب کو گایاں نہ سنے سکتا تھا مگر ان کی تذلیل کرنے سے نہیں چرکتا تھا اور میاں صاحب کو اپنے راجستے کا سنگ گراں سمجھنا تھا۔ میاں صاحب بڑی حساس طبیعت کے مالک

تھے اور ہر شریف آدمی حساس ہوتا ہے۔ یہی بڑا سلوک انہیں دیباک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ گیا۔ جب اپنا پرایا کوئی کر دیتا تو آہ بھر کر وہ جانتے مزید کر دیتا تو

فرماتے: وہ صاحب جا جتے ہیں کہ میں اپنے عہد سے سے استغنیٰ شے دوں
 تاکہ وہ خوب محل کھلیں کبھی کبھی کہ میں صاحب آپ بیرون ملک چلے
 جائیں پاکستان میں آپ کی کیا قدر ہوئی ہے۔ خیر چٹھوں کا ملک ہے
 یہاں آپ جیسے شریف آدمی کیسے رہ سکتے ہیں اور کبھی ارشاد فرماتے ہیں
 کہ تینوں ایمر سید چھٹنی پے گی۔ بھلا میں اس عمر میں کہاں جاؤں۔ دڑتا
 ہوں کہ کہیں غلطہ سلا الزام لگا کر شخص میری عمر بھر کی نیک نامی کو برباد نہ کر دے۔
 مرنے سے چند ہفتے قبل بہت ادا اس اور غمگین نظر آتے تھے۔ یگم صاحب
 کو دفتری پریشانیوں کے بارے میں کچھ نہ بتاتے مگر وہ ماحولیت غصے کی سحر
 اس روکسیا کی زیادتیوں سے آگاہ ہو جاتیں ایک دن آنسو چھوٹ پڑیں
 آپ بہت پریشاں نظر آتے ہیں۔ آپ کو دفتر کا غم کھائے چلا جا رہا ہے۔
 آپ نے مجھے کوئی بات نہ بتالے کی قسم کھا رہی ہے تو بے شک نہ بتائیں
 لیکن میں جانتی ہوں کہ فلاں فلاں شخص آپ کو ہر ممکن طریقے سے دوا کرنے
 کے درپے ہیں۔ خدا کے لئے استغنیٰ دے دیجئے ہمارے کون سے درجنوں
 بچے ہیں کہ بھوکوں میں گئے صرف ایک بچی ہے جس خدا نے پیدا کیا ہے وہ
 رزق بھی بیہم پہنچائے گا۔ اگر کوئی پست قامت بغل میں عہدے کی بیاباں
 لگا کر بلند قامت ہونا چاہتا ہے تو اس کا شوق پورا ہونے دیجئے۔ انشاء اللہ
 منہ کے بل گرے گا۔

جس دن میں صاحب کو دل کا جان لیوا دورہ پڑا ۲۶ ستمبر ۱۹۷۳ء ایک

ضروری فائل لے کر اپنے دفتر سے نکلے اور اس بد بخت انسان کے دفتر کے باہر گھنٹہ ڈریج گھنٹہ اس انتظار میں بیٹھنے لگے کہ مہاراجہ اندر کا دربار ختم ہو تو وہ فائل پیش کریں۔ وہاں سے اکٹا کر میاں نعیم الکریم راسٹنٹ کنٹرولر کنڈکٹ کے پاس آئیٹھے ٹیلی فون کیا۔ وہاں سے کوئی درشت جواب ملا فوراً چوٹکار کھو یاد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ میاں صاحب کی رنگت بدل گئی۔ بچے سے گئے۔ نعیم الکریم صاحب نے چائے کے لئے روکنا چاہا مگر نہ مانے اپنے دفتر سے چند گز کے فاصلے پر تھے کہ دل کا دورا پڑا اگر پڑے اور موصول بھی ہو گئے۔

جنارے میں دفتر کے چھوٹے بڑے سب شریک تھے الا جو غیر حاضر تھے یا جن کے دلوں میں خوف خدا کی جگہ افسر کا خوف تھا کہ مہاراجہ ان کی شرکت سے ناراض نہ ہو جائے! تمام لوگوں کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ مرحوم میاں صاحب کا ایک چھوٹا بھائی فوج میں کرنل کے متاثر عہدے پر فائز ہے اور کرنل صاحب کے ماتحتوں کو بھی پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ان کے کرنل صاحب کا ایک بھائی کنٹرولر امتحانات تھا جس کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ پتہ کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تم کو میرے صحبت نہیں رہی

سید شمس الحسن جعفری

”صدق صاحب! آپ کی براہِ نبی میری بجائے جعفری صاحب کے ماتحت کام کرے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگوں کے ہر طرح تشدد ہی اور دیانتداری سے میرے ساتھ کام کیا ہے اس طرح جعفری صاحب کے ساتھ بھی کام کریں گے غلطی ہو جائے تو انہیں دھوکے میں نہ لائیں صاف صاف بتادیں وہ آپ کو مداف کر دیں گے اور اگر آپ نے انہیں دھوکہ میں رکھا تو وہ تھپڑ مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔“ ریاض صاحب تریبہ کو اپنے کمرے میں چلے گئے مگر ہمارے منہ لٹک گئے۔ ہم نے ریاض صاحب کے ساتھ اچھا وقت گزارا تھا۔ انہوں نے افسری مکتبی کا فرق منادیا تھا ہمارا شدید سے شدید تر غلطی پر بھی ”نالائق“ اور ”بیوقوف“ کے علاوہ اُن کے منہ سے کوئی ناشائستہ لفظ نہیں نکلا تھا اب جو انہوں نے نئے اسے ایس جی جعفری صاحب کے تھپڑ کا ذکر کیا تو آنکھوں کے سامنے سوجے ہوئے چہرے نظر آنے لگے۔ ہم نے ریاض صاحب کو الوداعی پارٹی دی جعفری صاحب کو بلایا مگر ہمارے اصرار اور ریاض صاحب کی منت کے باوجود انہوں نے شرکت سے انکار کر دیا۔ ہم اور ہم گئے۔

دوسرے دن میں ایک فائل لے کر ان کے کمرے میں گیا۔ کرسی پر ایک

تناسب قد و کاٹھ اور سائلی رنگت کے، کلین شیو، ایک صاحب براجمان
تھے۔ آنکھوں پر سفید شیو کی عینک، اعلیٰ گڑھ کٹ کا پاجامہ اور شیروانی
زیب تن کئے ہوئے تھے۔ جس تیزی سے پان کی جگالی فرما رہے تھے اسی
تیزی سے فائل پر لکھتے چلے جا رہے تھے۔ لکھنے سے فارغ ہوئے تو مجھ
پر نظر پڑی۔ خاص لکھنوی انداز میں کہا: اماں بھئیو کیا لائے ہیں نے فائل
کھول کر آگے سرکادی۔ دستخط کرتے۔ میں باہر آگیا۔ یہی واردات بلیک بونی
کے ساتھ گذری۔ چند دن ہم بہت سمجھے رہے۔ آہستہ آہستہ میں معلوم ہوا کہ
جعفری صاحب تھیں صرف اعظم ملک دشمن ملک مرحوم کوہستان دہلے لائق
ترین باپ کا نالائق ترین بیٹا، جیسے پھڑلے باز کرکوں کو مارنے ہیں
جو غلطی بھی کرتے ہیں اور اسے تسلیم بھی نہیں کرتے۔ ہمارا خوف آہستہ آہستہ
دور ہوتا گیا اور جعفری صاحب ہماری کارکردگی سے متاثر ہو کر ہمارے قریب
آتے چلے گئے اور کوہت با اینجا رسید کہ ہم نے جعفری صاحب کی غفلت
سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی چائے بمکٹ اور پالوں پر ہاتھ
صاف کرنا شروع کر دیا یہ جرم قابل دست اندازی پولیس ہو یا نہ ہو قابل دست
اندازی اسبیل شمنٹ ضرور ہے۔ لہذا اس ذکر کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

چائے اور پان جعفری صاحب کی لازمی غذا ہے جس طرح ہم اور آپ
روٹی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اسی طرح چائے اور پان ان کے لئے
لازمہ حیات ہے۔ گھر ہو یا دفتر۔ آندھی آئے بارش آئے، گرمی ہو یا سردی
جعفری صاحب کی قاعدے کی چائے کا دور چل رہا ہے۔ قاطبیس اور چلی میں

فائیس جا رہی ہیں۔ ٹھکنے کا نام نہیں۔ چائے کے بعد پان کی ڈبیہ کھل رہی ہے
 بند ہو رہی ہے۔ ان کی قاعدے کی چائے میں دو دو چمچہ بھر سے زیادہ ڈالنا
 گناہ کبیرہ سے کم نہیں۔ چائے کے بارے میں مولانا ابوالکلام مرحوم کا سا
 مذاق رکھتے ہیں اور پان کے بارے میں شوکت تھانوی (سودیشی روئل والے)
 کے متعلقہ ہیں۔ ان کی کثرت چائے نوشی اور پان خوری سے متاثر ہو کر میرے
 جی میں آیا کہ انہیں ابوالکلام کی غبارِ خاطر اور شوکت تھانوی کی بارِ خاطر تحفہ
 پیش کروں کیونکہ اول الذکر میں چائے ہی چائے ہے اور ثانی الذکر میں پان
 ہی پان ہیں مگر قدرت کو منظور نہیں۔ لکڑیوں کی اور کون سی مرادیں ہو سکتی ہیں جو
 یہ برکتی پانچ سال سے ماہانہ بجٹ خسارے میں جا رہا ہے۔

نام شمس الحسن چونکہ سادات سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے سید امام
 جعفر صادقؑ کی اولاد ہیں اس لئے جعفری۔ گوندہ میں پیدا ہوئے اس لئے
 گوندوی۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی اس لئے علیگ۔ تو پورا نام سید شمس الحسن جعفری
 گوندوی علیگ ہوا۔ گوندہ نے دو علمی رجحان پیدا کئے ایک اصغر گوندوی دوسرے
 سید شمس الحسن جعفری گوندوی۔ دونوں قسمت سے گلہ ہے کہ غلط دور میں
 پیلے کئے گئے۔ اول الذکر کا شعبہ ہے

ثالثہ محبت کوئی ان میں نہیں اصغر

کافر نہیں دیکھے کہ مسلمان نہیں دیکھا

اور ثانی الذکر کا ارشاد ہے: لٹری کوئل سے منورہ گرا اور تک پہلے جالیے ہر

مقام پر ایمان دار آدمی کا کال ملے گا یہ حقیقہ کے لحاظ سے شیعہ ضرور ہیں۔ اللہ

شیعہ بھی اثناعشری مگر کم ظرفوں کی طرح غلو اور تعصب ان کی طبیعت میں نام کو نہیں۔ راقم الحروف نے خود بار بار انہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طبیعت، حضرت عمر فاروقؓ کی عظمت کی عدالت، حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ کی حیا اور حضرت علیؓ مرتضیٰؓ کی شجاعت کی قیسیں کھائے سنبے۔ چاروں خلفاء راشدینؓ کو اسلام کی عمارت کے چار بنیادی ستون قرار دیتے ہیں بالفاظ دیگر ان کی نظر میں بطول مولانا ظفر علی مرحوم سے

ہیں کہ میں ایک ہی مثل کی، ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ، ہم مرتبہ ہیں یا ران نبی، کچھ فرق ہمیں ان چاروں میں بڑے آدمیوں کی طرح جعفری صاحب کی تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے لہذا عمر کا صحیح تعین مشکل ہے۔ میاں مجھ بڑے آدمی پر رحم کرو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ سننے سننے ہم بڑے ہو چلے ہیں مگر جعفری صاحب درجن بھر بچوں کے باپ بننے کے باوجود جہاں تھے وہیں ہیں۔ گردشیں بیل دہنہ ران کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔ گو ترقی کی زرخیز زمین سے پیدا کیا علیؓ کچھ لئے پروان چڑھایا۔ ریاست بہادر پور نے آبپاری کی۔ ملتان نے آغوش والی۔ حافظ نے راہنمائی کی اور جعفری صاحب تعلیمی بورڈ ملتان کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور ازاں بعد سیکرٹری ہو گئے۔

سناٹے سے کام لینا انہیں آتا ہے اور اس میں ان کی زبان دانی کو بڑا دخل ہے کسی شخص کو آپ کہہ سولی پر چڑھ جاتے تو وہ آپ کے گلے پر جاتے گا مگر یہی بات جعفری صاحب کہیں تو وہ سولی کو معراج سمجھ کر فی الفور

سے ہی خفقان ہونے لگتا ہے۔ ارشاداتِ جعفری کے لئے جعفری صاحب
کی ریٹائرمنٹ کا انتظار کریں۔ ہاں البتہ اُستاد محترم پر دنیہ مرزا عبدالحی صاحب
کہ جعفری صاحب کے بار بار ہیں، تحریری ضمانت دیں تو ارشاداتِ جعفری
پہلے ہی منظرِ مہجور پر آسکتے ہیں۔

تعمیل کرے گا۔ دن بھر میں دو چار جملے کسی کے بارے میں ایسے ضرور اتر اتر جائیں گے کہ جنہیں سن کر دن بھر کی نیندیں دور ہو جائیں۔ ”ارشادات جعفری“ کے عنوان کے میں نے انہیں لکھنا شروع کر دیا تھا اور بعض خلوتیانِ راز نے قلمی اعانت کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر ”ارشادات جعفری“ کی اشاعت سے پہلے جعفری صاحب سیکرٹری بنائے گئے اور ”ارشادات جعفری“ تشنہ اشاعت رہ گئے جعفری صاحب سے ڈر نہیں لگتا البتہ بورڈ کے قانونی مشیر جناب مرزا غلام احمد صاحب سے ضرور ڈرتا ہوں اور ہر شریف آدمی کو حکیموں ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ وکیلوں سے بھی ڈرنا چاہئے۔ ”ارشادات جعفری“ کتابی صورت میں ان کے سامنے ہوں تو فی الفور مشورہ دیں گے۔ ”جعفری صاحب آپ عزیز کو بورڈ کے فلاں رول کے تحت یہ سزا دے سکتے ہیں۔ ہائیں کیا کہا؟ اس نے مستغنی ہو کر پان سگریٹ کی دکان کھول لی ہے، اچھا فکر کوئی بات نہیں دفعہ ۸۸۹ کے تحت آپ ہتک عزت کا داغ دیں۔ کیس میں آپ کو جتو اوونگا؟ اور پھر عدالت میں جج کس کی مجال ہے جو مرزا کو چیت کرے ڈکلیوں کی نانی اور سیرے محترم آغا علی احمد خاں صاحب ایڈووکیٹ کو بھی عدالت میں مرزا صاحب کے سامنے سر پکڑتے دیکھا ہے ویسے مرزا جتو بہت خلیق اور ملنسار آدمی ہیں عام طور پر اہلکاروں کے حق میں ہی مشورہ دیتے ہیں چاہے کارکنانِ قضا و قدر مانیں یا نہ مانیں مگر اول و آخر وہ بورڈ کے قانونی مشیر (Legal Adviser) ہیں اور میں نے جب سے حبیب جالب مرحوم کی نظم ”ایڈوائزر“ پڑھی ہے مجھے ایڈوائزر کے نام

بے کارواں بڑے دم گئے۔ ان کے منکر ذکر جانی۔ کل آپ کا برا بھلا افسر انہی سیٹ پر ہو گا۔ ساوھو بابا نے آنکھیں بند کر کے جواب دیا اور دوسرے دن فی الواقع افسر انہی سیٹ پر تھا۔ ساوھو بابا پر ہمارا اعتقاد اور بڑھ گیا۔ ان کا سطا کہ وہ افسر محض افسر ہی نہ لگتا تھا بلکہ افسر شہر یاراں معلوم ہوتا تھا۔

مجھے تعلیم الکریم کہتے ہیں۔ ہجرات میرا جنم بھومی ہے۔ ایم۔ اے۔ شماریات کے اوّل محکمہ جنگلات میں ملازمت اختیار کی وہاں سے دانہ پانی ملتا اور بورڈ میں کھینچ لایا۔ امید ہے کہ آپ لوگ میرے ساتھ دیانند اور انہی طور پر تعاون کر گئے۔ ہم لے تو مقدار بھر دیانند اور انہی طور پر تعاون کیا گو میاں صاحب میں ہر ایک ہلکا کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کی عادت آج تک موجود ہے۔ اپنے ہم مرتبہ افسروں سے بھی کچھ کچھ کہتے ہیں جھگڑی ہرن کی طرح سہم سہم کر چاروں طرف دیکھتے ہیں اور بورڈ کے ویرانہ آباد میں خود کو اکیلا سمجھ کر مزید سہم جاتے ہیں۔

سہ نہ محرمے، نہ شفیقے نہ تہد سے وادم

حد مرثیہ دل پر کہ گویم، عجب غمے وادم

گو میوں کا موسم تھا اور آدموں کی بیمار چھاننا لب کا کونسا ایسا ناخلف بھینجا ہے جسے آدموں سے پیار نہیں، چنانچہ آم کھانے کے بہانے بند بوسن جا کر کپکپ منالے کا پروگرام میاں صاحب کے ایثار بنایا گیا۔ بن۔ بوسن کے با میوں دکا کا عمر اور زند حسین، سنے پارتی کے اغلام کا بیڑا اٹھایا۔ بیگم عمر سے دوہہ نرا ہم کیا، اور ہم ایک انوار کی صبح کو فوراً بستر باندھ کر بن بوسن جا چکے۔ آخر ف پوری ہو رہا

منٹا بورڈ (۱) نے آواز کا جادو جگایا، انہیں کلر کی نہ ملتی تو مہدی حسن کو چھلے
 بچتا نظر آتا۔ حاجی جان محمد نے میرٹھ کے فرائض سرانجام دئے۔ ام کو پیسے
 ہر میں نہائے۔ مرنے اڑے اور سر شام، عام لوگوں کے برعکس، ہلکی خوشی
 واپس آئے۔ گو تباہ کو جمع لگانے کے لئے ایک موضوع ہاتھ آگیا۔ لوجی
 نئے اے ایس جی نے آئے ہی کھانا پینا شروع کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک
 افسر مجاز نے جس کا حوصلہ اس کی تعلیمی قابلیت کی طرح پست تھا۔ میاں
 صاحب کے منہ پر کہہ دیا۔ میاں صاحب! ویسے تو آپ بڑے مسازی
 پر ہنر کار واقع ہوئے ہیں مگر اپنی سوز و کی کے لئے سٹور سے پٹرول کا خرچ
 تو نکال ہی لیتے ہوں گے۔ اور میاں صاحب دل میں ہی کھینچتے رہے
 اس شخص کو کوئی مسکت جواب نہ دے سکے جس کی سرکس ملک اس کے
 گناہوں کی گٹھری کی طرح بوجھل ہوتی چلی جا رہی تھی۔

لوگوں کے طعنے ہمنوں اور مہدی ہونے کے باوجود میاں صاحب نے
 جس احسن طریقے سے اُسے۔ ایس جی کی صیٹ کو چلا یا وہ انہیں کا حصہ ہے
 اور میاں صاحب جیسے محنتی اور دیانتدار افسر کا وجود بھاری سے اولاد کے لئے
 باعث فخر ہے۔ کچھ مدت کے بعد ان کا قبول ہو گیا بہت خوش ہوئے کہ
 چلو یا لوگوں کے طعنوں سے تو نجات ملی مگر ان کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ انٹر
 اور کنڈکٹ برائچوں میں کچھ دیر نگلشت کرتے ہوئے واپس اپنی پہلی سیٹ پر
 آچکے ہیں۔

میاں صاحب بورڈ کے داعی یا بندہ صوم و صلوۃ افسر ہیں۔ تبلیغی جماعت

کے رکن بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نیک مخلوق کے ساتھ پتلے بھی کات چکے ہیں
سفید قفس مشعل ازرب تن کئے، سر پر کشتی لٹا کپڑے کی ٹوپی مہمائے، گلے
میں تسبیح ڈالے، سوزو کی کے پیچھے بستر نور پر باندھے کسی تبلیغی دور سے کوہ چکے
ہیں۔ جب کلاس ون افسر تسبیح دھستے پر قبضہ کر لیں تو پھر ہم ایسے درجہ سوم
کے لوگ کہاں جائیں!

سرخ و سفید رنگت، ہلکی جسامت، بلند قامت، جب چلتے ہیں تو رخ

اٹھکیاں سر اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

کھلا ماتھا، باریک ابرو، لمبھی آٹھکیں، ستواں ناک، سرخ چٹے چٹے
ہونٹ، ریش فائبر، بروت حاضر میاں صاحب جہاں ہوں جس لباس میں
ہوں ان کے اس چہرہ نما سے آپ انہیں بخوبی پہچان لیں گے۔

تھوڑے دن ہوئے ایک صاحب فرما رہے تھے عزیز صاحب آپ
کے نعیم اکرم صاحب کو صاحب۔ بے ٹکڑہو گیا ہے اس وقت سے وہ نعیم
رہے ہیں نہ کریم کچھ اودھ بن گئے ہیں۔ خدا کرے کہ ان صاحب کا بد تازہ غلط ہو

منشی ہر کوپال تفتہ ملتانی

یہ فتنہ آدمی کی غائریاتی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
(غالب)

میں اکابر ملت اور عمائدین حکومت کو بروقت انتباہ
کرتا ہوں کہ جس ملک کے مذک حرام قائد اعظمؒ کا ملک ملال
نہ کر سکے۔ جو رگ آقا و مولا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
دفاع و ارادہ بن سکے اور قائد اعظم کی زندگی میں انہیں مسلمان تسلیم
نہ کرتے رہے، اُن کی ملک حرامی کو کس طرح معاف کیا جاسکتا
ہے، ان کو پالنا ساپنوں کو چلو ول (دودھ پلانا ہے)۔
(امیر شریعت)

بیل بستان بخاری — سفیر اسلام قاضی احسان احمد شجاع آبادی

رات کے گیارہ بجے ہیں قلعہ کہنہ قاسم باغ میں مدرسہ قاسم العلوم کے سالانہ جلسہ کا آخری اجلاس ہے لوگ ہلنے کا نام نہیں دیتے۔ کیونکہ آخری مقررہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی تقریر ہونا باقی ہے۔ قاضی صاحب اسٹیج پر تشریف لگتے ہیں۔ سرخ و سفید رنگت، دودھ کی مانند اعلیٰ دائرہ غولبورت اور قناسب ناک نقشہ، سر پر حسب معمول رومال کا کنڈل مارے، سفید کرتہ۔ اور شلو ازب تین کتے ہیں۔ بڑھا پا بہت کم لوگوں کا حسین ہوتا ہے اور قاضی صاحب کا بڑھا اپنے مرتبی سی عطاؤ اللہ شاد بخاری کی طرح فی الواقع جیسی تھا نعرہ تکبیر اور نعرہ ختم نبوت کی گونج میں انہوں نے نغمہ توحید بھڑا۔ قرآن مجید کی آیات تلاوت فرماتے ہیں۔ آواز میں اتنا گداز اور اثر ہے کہ درحیں تکرار ہر وہی ہیں دل چاہتا ہے کہ وہ تلاوت فرماتے رہیں۔ ہم سنتے رہیں۔ تلاوت کے بعد توحید کے فطری اور لغوی معنی بتاتے ہیں۔ اور توحید کے سلسلے میں ایک واقعہ سناتے ہیں۔ زبان کی لکنت امیر شریعت بخاری کے بلال کی شان

نوصارہی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ایک دن حضرت بایزید بطاحیؒ کے پاس ایک باپردہ عورت آئی اور کہنے لگی "یا حضرت! میرے غاوند نے دوسری شادی کر لی ہے اے کہئے کہ دوسری بیوی کو طلاق دے دے۔" آپ فرماتے ہیں کہ جب شریعت نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ تو میں شریعت کے احکام میں مداخلت کرنے والا کون ہوں۔ وہ عورت عرض کرتی ہے کہ یا حضرت آپ نے میری صورت نہیں دیکھی۔ میں ایسی حسین عورت ہوں کہ چشم فلک نے میری جیسی حسین عورت نہیں دیکھی ہوگی۔ غاوند کی دفا شعار ہوئی۔ میرے ہوتے ہوئے اے میرے سر پر سو کن لا بٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا دل مارے غم کے پھٹا جاتا ہے۔

حضرت بایزیدؒ نے "موج حق" کا نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو مریدوں نے وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ "حسن غانی تو یہ بات گوارا نہیں کرتا کہ اس کی ذات میں کسی کو شریک کیا جائے کوئی اس کے حق میں دخل انداز ہو تو وہ حسن لافانی کب گوارا کرے گا کہ اس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کیا جائے۔ تو کیا حضرت بایزید بطاحیؒ زیادہ حق شناس تھے یا تم لوگ کہ شرک میں مشرکین مکہ کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ گئے ہو؟ تو کیا قرآن حکیم کی یہ آیت ختم اللہ علی قلوبہم..... انہیں لوگوں کے بارے میں ہمیں جو خدا کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کرتے ہیں۔ حق کا مستحضر اڑاتے ہیں قرآن کو قرآن میں ڈوب کر ٹپے شرک کی دیواریں گرتی چلی جائیں گی اقبال کو قومی شاعر تو مانتے ہو مگر اس کی کسی بات پر کان تو دھردے

ۛ قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اشر کرے عطا تجھے جدت گوارہ

دیوبندی اور بریلی مناقشات کا دور ہے چونک بالا ارسلان میں تعید
اور شان رسالت کے موضوع پر تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئٹوں
کھدروں میں چھپے ہوئے خالین مخالفانہ نعرے لگاتے ہیں۔ کئی ٹمر پنہ
پتھر بھی مارتے ہیں۔ آپ کی آواز ابھرتی ہے۔ ہاں ہاں میں احواری ہوں
مجھے احواری ہونے پر فخر ہے۔ ہم لے ادا ہمارے آبا لے فرنگی کے منہ پر
تھپڑ مارے۔ ہمارے ہی علمدار حق کو کھپانسی ملی۔ ہمارے ہی بھائی بند
جلا وطن کئے گئے۔ ہم لے قید و بند کے مصائب جھیلے۔ خون گلے لگائے
سنت منصوبہ پوری کی۔ سنت یوسفی مکو لگے لگایا۔ ڈم ڈم حملیسا کہ سنٹرل جیل
ساہیوال، بلوئشل جیل بہاول پور، جہیں نہیں برصغیر کی ہر جیل سے ہمارا حال
پوچھو۔ میں اپنے پیر و مرشد بخاری کی صرح ادھار رکھنے کا عادی نہیں۔ سنو
ہم تمہاری طرح جیل سے معافیاں مانگ کر باہر نہیں نکلے تمہاری اور تمہارے
آباد کی تو عمریں انگریز بہادری کی جوتیاں چاٹنے اور گوانش بجالاسنے میں
گڈری ہیں۔ ترک مسلمانوں کے سینے تمہاری گولیوں سے چھلنی ہیں۔ یا
ہماری گولیوں سے، تم بتاؤ انگریز کی فتح اور ترکوں کی شکست پر جشن چڑھاں
کس نے منایا، تم سمجھتے ہو کہ انگریز بہادری نے آزادی سوغات کے طور پر
بمیں دی ہے۔ نہیں نہیں یہ تو ہماری قربانیوں کا ثمر ہے یہ اور بات ہے
کہ راہزن راہبر بن بیٹھے۔ محسن بھوپالی کب یاد آیا۔

نیرنگی سیاستِ دوراں کو دیکھتے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے
یہ تھرا دھڑ دھڑ کیوں پڑ رہے ہیں؟ قاضی احسان پر کیوں نہیں پڑتے
چودہ سو سال سے رنگِ زنی کر رہے ہو پھر بھی نشانے خطا جا رہے ہیں تم
ابو جہل اور ابولہب کی تقلید میں رنگِ زنی کرتے رہو۔ میں اپنے آقا سرکار
دو عالم علیؑ علیہ السلام کی اجلاس میں تھم کھاتا رہوں اپنے اپنے فیصلے کی
بات ہے۔

یہ تھے قبلِ بتانِ بخاری۔ مغیرہ اسلام قاضی احسان احمد شجاع آبادی
مرحوم و مغفور جن کے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں۔
جب یاد تیری آدے سے ہے تب اشک بھر آئے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جسگر آئے (میر)
مطبوعہ صفت روزہ چٹان
۳۰ دسمبر ۱۹۷۷ء لاہور

تحریک نجم نبوت کا ایک ہیرو —

سید مظفر علی شمس

مجھے ہر اس شخص سے پیار ہے، جسے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمۃ سے پیار ہے یہ خواہش ناقص نہیں رہی کہ اس عظیم شخصیت کی قرآن خوانی اور تقریر اپنے کالوں سے سنوں۔ کیونکہ جیب ہوش نے آنکھیں کھولیں تو شاہ جی پر تقریر نہ کرنے کی پابندی عائد تھی، حتیٰ کہ شاہ جی وفات پا گئے اس ناروا پابندی سے قبل ایک تبلیغی جلسہ کا دھندلا سا عکس ذہن میں ہے۔ آپ باغ لانگے خاں، عثمان امین تقریر کرنے آئے تھے۔ لا باقہ دو ہر بدن، بڑی بڑی آنکھیں بکھلا ماتھا، سفید رزمی، ہاتھ میں کلباڑی، کھدک کا لباس پہنے، گئے میں قلندروں کی طرح چادر ڈالے آپ مائیک پر شریف لائے امیر شریعت زندہ باؤ کا نعرہ اس زور سے گونجا کہ پلاٹ کے کوسے کھدروں میں بسے اور ارٹھنے والے جاگ اُٹھے۔ شاہ جی نے کس سورۃ کی تلاوت کی؟ تقریر کا موضوع کیا تھا؟ یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا مجمع سراپا نیا لہذا ان کی تقریر کو دلچسپی سے سراپا گوشہ بن کر سن رہا تھا، کبھی سا رہ جمع آؤد بکا، اگر یہ رزادی میں

دوب جاتا تھا اور کبھی زعفران دار کشمیر کی طرح کھلا پڑتا تھا۔

شاہ جی کے دو عظیم ساتھی نواب زادہ نصر اللہ خاں اور سید مظفر علی شاہ شمس
عثمان میں تشریف لائیں اور میں ان کی تقریر سننے سر کے بل زبواں ناگھن بات
تھی چنانچہ ۳۱ اگست بروز جمعہ دفتر سے چھٹی کر کے سید صاحب گاہ پہنچا۔ جہاں ختم نبوت
کنونشن کے اجلاس میں ان دونوں راہ نماؤں نے بھی تقریر کرنا تھی۔ دونوں اپنا
نماز جمعہ کے بعد دیگر علماء کی معیت میں تشریف لائے۔ نعرہ بکیر اللہ اکبر نعرہ
رسالت یا رسول اللہ اور نعرہ حیدری یا علی سے امن کا استقبال کیا گیا بحبت
اخوت اور رواداری کا ایسا روح پرور منظر میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں
نے ایسا محسوس کیا کہ کمری صدارت پر مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ نہیں بلکہ
امیر شریعت تشریف فرما ہیں۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں پر بقول مولانا ابوزر نجاری
ابن امیر شریعت تقریر آئی ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے تقریر نہیں کی۔ بجلا
چار چار چھ گھنٹے بلا ٹکان بولتے والے امیر شریعت کے جانشین دس
منٹ کے محدود وقت میں تقریر کیا کرتے۔ اتنے مختصر وقت میں تو ہمارے
نواب زادہ صاحب حقے کا ایک کش لگا سکتے تھے۔ مگر مسجد میں حقہ کہاں سے
آتا۔ لہذا پان سے اس کی تلاقی کر رہے تھے۔ البتہ جب سید مظفر علی شمس نے
تقریر شروع کی، تو عام لوگوں کے ساتھ سید دبیر علی ایچ سیکرٹری کو بھی وقت
کا احساس جاتا رہا۔

شمس صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا محضرات! ایچ سیکرٹری
سید دبیر علی نے حضرت علامہ شمس کے عنوان سے میرا تعارف کرایا ہے، لفظ علامہ

پہچھے، اعتراض ہے۔ بھلا شکل و صورت سے علامہ دکھائی دیتا ہوں میں عالم نہیں
ایک عالم مسلمان ہوں، ایک عرصہ سے بزرگوں کی صحبت میں منور و مجتہد رہا
ہوں۔ میں تو بزرگانِ دین اور علماء کرام کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس
کرتا ہوں یہ کاریں تشریف لائیں، میں دروازہ کھولوں، یہ چلیں، اور میں ان
کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کر دوں۔ اس لئے کہ اپنا مقام باقیا ہوں، یہ
۱۹۵۳ء کی بات ہے، حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا دورہ
تھا۔ ارے، بخاریؒ کو جانتے ہو یا بھول گئے؟

زباں پر بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق لے لے بڑے مری زباں کے تھے
کافی دیر سے نعرے سن رہا تھا، شاہ جیؒ کے نام کا نعرہ کسی گوشے سے
نہیں رگتا۔

عنانِ دل و اتم بھی بخاریؒ کو بھول گئے، اس تحریر تک ختم نبوت کے
بانی کا نام، اس قافلہ سالار کا نام، اس میر کارواں کا نام، تمہاری زبان پر
نہیں آیا، جس کی ساری زندگی ناموس رسالت کی حفاظت میں گزر گئی
جس نے کہا تھا ایک زندگی مستعار لایا تھا کچھ ریل میں گزر گئی، کچھ حیل میں
گزر گئی۔ اب لوگوں کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ امیر شریعت زندہ ماؤ
کے فلکِ فرگات نعرے لگ رہے تھے، اشکوں کے دریا بہہ رہے تھے
بخاریؒ کی یاد میں کون سی آنکھ تھی جو پرہیز نہیں تھی شمسِ صاحب کی آواز بھی
جھگو گیر ہو گئی، وہ ماضی میں کھو گئے۔ فرمایا: وہ قافلہ نظر نہیں آتا، جس کے سردار

بخاریؒ تھے۔ مولانا ابوالحسناتؒ، میں انہیں ڈھونڈتا ہوں، کہاں چلے گئے
مفتی کفایت الشد کا پتہ نہیں کہاں چلے گئے، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نظر
نہیں آتے، مولانا داؤد غزنویؒ کا کچھ پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔

مے صو رتیں الہی! کس دیں بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
کیا فی الواقعہ وہ چلے گئے؟ نہیں نہیں وہ تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اپنی
برسوں کی محنت کو دامن میں لئے۔

اللہ سے یہ دیکھو! تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں شمسی معاصی نے
ہاتھ کا اشارہ اگلی صفوں کی طرف اس چوڑی سے کیا کہ تمام لوگوں کی نگاہیں
اگلی صفوں کی جانب اٹھ گئیں پچھلی صفوں میں بیٹھنے والے ایڑیاں اٹھا اٹھا
کر دیکھنے لگے جس طرح فی الواقعہ وہ اکابر امت اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ہیں
یہ خطاب کا سحر تھا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے جس کے چہرے کی جھریاں
اس کی کبر سنی کی غمازی کر رہی تھیں۔ کہنے لگے، شاتم رسول کی دل آذر کتاب
وزکیلا رسول کی خدمت کے سلسلہ میں جو احتجاجی جلسہ ہوا تھا، اس میں امیر شریعتؒ
نے سجان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مفتی کفایت الشد کو دورانِ تقریر مخاطب
کر کے فرمایا۔

آج مفتی کفایت الشد اور مولانا احمد سعید کسمپاشی پر ام المؤمنین عائشہ
صدیقہؓ اور خدیجہ الکبریٰؓ آئیں، اور فرمایا کہ ہم تمہاری باتیں ہیں، کیا تمہیں معلوم

نہیں کہ کافروں نے ہمیں گایاں دی ہیں دیکھو ایک دم پلٹ کر فرمایا اللہ سے
دیکھو تو اے اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں
شاہ جی کی اس اوپر روئیں شکار ہو گئیں، نصف صدی بعد وہ منظر آج پھر نظر
آ رہا ہے۔

شمسی صاحب اپنے موضوع کی طرف پلٹے۔

میں کہاں پہنچ گیا بات علامہ کے لفظ پر شروع ہوئی تھی، کراچی میں جلسہ
تھا مولانا ابوالحسنات مدد تھے، مولانا حامد علی بدایونی ایجنسی سیکرٹری۔ انہوں نے
فرمایا کہ اب علامہ شمسی صاحب تقریر کریں گے، میرے پاؤں سن ہو گئے۔ زبان
کے ساتھ چھوڑ دیا۔ بن پکی طاری ہو گئی ایجنسی کے ایک کونے میں امیر شریعت
بھی تشریف فرما تھے، میری یہ گھبراہٹ دیکھی تو سلس کر باواز بلند فرمایا، علامہ صاحب
بسم اللہ کہتے، ان کی مسکراہٹ نے سچا کام کیا، ان کی آنکھوں کی چمک
نے حوصلہ دلایا، میں نے جواباً کہا شاہ جی یہ چودھویں صدی ہے۔ اس دور میں ہر
سکے جیتا ہے، وہ اگر نبی ہو سکتا ہے جس کا نام لینا میں گناہ سمجھتا ہوں، تو میں
بھی علامہ ہو سکتا ہوں۔

ہاں تو عثمان و ابوالہریرہ یہاں کس کا عشق کھینچ لایا ہے، جس کے عشق میں جینا
بھی زندگی ہے مرنا بھی زندگی ہے۔ وہ وہ ہے، جب کوئی مخلوق نہ تھی وہ تھا۔
درخت ہزار محنت کرے، حیوان نہیں بن سکتا۔ حیوان ہزار محنت کرے، انسان
نہیں بن سکتا۔ انسان ہزار محنت کرے، نبی نہیں بن سکتا۔ نبی لاکھ محنت کرے
نبی اسطرح انسان نہیں بن سکتا۔ وہ نذر الانبیاء، وہ ختم المرسلین، وہ مولا ہے کل، وہ وہ

خلق کائنات، جو وہاں پہنچا، جہاں جبریل کے پر ملتے ہیں۔ وہاں پہنچا جہاں
خالق اور مخلوق میں صرف قلب قرین کا فرق تھا، وہاں صرف رحم کرنے
والا تھا، اور رحم مانگنے والا تھا، مجھ میں یہ بہت کہاں کہ اسکی صفات کو بیان کر سکوں
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مخمر

اس کے مقابلے میں کوئی دعویٰ نبوت کرے تو مسلمانوں کی غیرت کیسے
گوارا کر سکتی ہے ہماری تحریک نہ یہی ہے سیاسی نہیں، اگر ہماری تحریک
سیاسی ہوتی، تو اس کا قائد سید یوسف بنوری نہ ہوتا۔ جب سے پاکستان میں
آئے، گوشہ نشین رہے، یہ بورینیشن بزرگ جسے امیر فیصل آئے، سلام کرے
کر تل قذافی آئے سلام کرے، اسے بھلا سیاست سے کیا واسطہ؟ یہ گوشہ نشین
بزرگ ایک دم میدان میں کیوں آگیا؟ اسے نبی آخر الزمان کا عشق کچھ نہ لایا
ہے۔ آخر حسین علیہ السلام، نبی کا لاڈلا نواسہ، نانا کے روضہ کو چھوڑ کر گر بلا
کے میدان میں کیوں نکلا؟ غلطی کا لال گھر سے نکلا، بال بچوں کو شہید کر دیا۔
سید بنوری بھی تو اسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، ذرا ان کا چہرہ تو دیکھو
ان کی شرافت تو دیکھو، ان کا تقویٰ تو دیکھو، ان کا تقدس تو دیکھو، ان کا لب و
لہجہ تو دیکھو، یہ مرنے کے لئے میدان میں آئے ہیں، مارنے کے لئے نہیں
سیدنا صدیق اکبرؓ نے سیلہ کذاب اور اس کے ٹولے کو تہس نہس کر کے
ختم نبوت کا تحفظ کیا، حسینؓ نے کبنہ شہد کر کے ختم نبوت کا تحفظ کیا، کبھی
قل کو کے ختم نبوت کا تحفظ نہ تھا، کبھی قتل ہو کے ختم نبوت کا تحفظ نہ تھا، یہ خلفائے راشدین
کا دور نہیں، اگر وہ مبارک دور ہوتا تو ہم کچھ اور سوچتے آج ہم مرنے کیلئے گھر سے نکلے

ہیں، مارنے کے لئے نہیں، ۱۹۵۳ء میں مگر مارنے کے لئے چلے تھے اس وقت کے حکمرانوں کو غلط فہمی ہوئی، انہوں نے تشدد کا سہارا لیا، ہم نے قربانی پیش کی، اتنی قربانی چشم فلک نے کر بلا کے بعد نہیں دیکھی، ہمیں غامض بر باد کر کے غلام محمد نے کہا۔

”ختم نبوت کے مسئلے کو دفن دیا گیا ہے“

ناظم الدین نے کہا،

”مسئلہ ختم کر دیا گیا“

سکندر مرزا نے کہا،

”یہ مسئلہ اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا“

مگر امیر شریعت کہتے تھے کہ۔

”مسئلہ ختم نہیں شروع ہو گیا ہے“

پھر لوگوں کو بتاؤ کس کی بات رہی؟

۵۔ نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مرزا قلعہ دار کی بارگاہ میں ہے

غلام ختم ہو گئے، غلام محمد کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونا نصیب نہ

ہوا، ناظم الدین کا اقتدار بھی مات کھا گیا، سکندر مرزا وطن سے دور بے کسی کی

موت مرا اور وطن سے باہر دفن ہے۔

گولی چلا کر مسلمان سپہاگروں کے سپہاگ لڑنے والا، ماؤں کی گود خالی

کر لے والا — رزغہ ہے مگر بیوہ کے آئینوں کی طرح اس کا کوئی پرسان

عال نہیں، بخاریؒ آج بھی زندہ ہے، شہدائے ختم نبوتؐ کج بھی زندہ ہیں، ہم نہیں
سلام کرتے ہیں، ہم نے ۱۹۵۲ء میں بھی قربانی دی تھی، آج بھی قربانی دینے
کے لئے تیار ہیں، میں بر ملا کہتا ہوں، کہ ہم تشدد کے قائل نہیں۔ انشاء اللہ
ہماری طرف سے کوئی تشدد نہیں ہوگا۔ مدگانی اچھی نہیں ہوتی ہیں حکومت
پر اعتماد ہونا چاہیے، اور حکومت کو ہم پر ستمبر کی تاریخ قریب آرہی ہے
انشاء اللہ عوام کی دیرینہ خواہش کے مطابق فیصلہ ہو جائے گا۔ دواعیلنا الا ابلاغ
دوہرا بدن، میانہ قد، سرخ و سفید رنگت، سفید شیشوں والی عینک میں سے
جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، پان سے نعلین کئے ہوئے ہونٹ، ایش عناق
بروت غائب، سفید کرتا اور سفید جامہ زیب تن، چال میں ایک شاہانہ
وقار، گفتار میں تیغ ذوالفقار، یہ تھے سید مظفر علی شمس — امیر شریعت
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے قافلہ تربیت کے ایک سالار، تحریک ختم نبوت
کے ایک پیرو، جنہیں ایک بار دیکھا، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔
مطبوعہ ہفت روزہ چنائی

(۹ نومبر ۱۹۷۴ء لاہور)

نوابزادہ نصر اللہ خاں

ملک کے نامور سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خاں کا قلمی خاکہ پڑھنا ہو تو دور الوبی کے چٹان کی ورق گردانی کیجئے کہیں نہ کہیں شورش کا شمیری کے یہ الفاظ آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ سیاسیات میں نوابزادہ نصر اللہ خاں کا تخلص حقیقت ہے۔ حقہ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتے۔ سفر و حضر میں ان کے غمگسار کا نام حقہ ہے۔ خدا معلوم گورانی صاحب زیادہ جتنی ہیں یا نوابزادہ۔ بہر حال رہنے والے دونوں ایک ہی ضلع کے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ مظفر ٹوٹ کے ضلع میں حقہ اور آتم کثرت سے کاشت ہوتے ہیں۔ میر تقی میر نے زندگی بھر ری چہرہ لوگوں کی یاد میں اتنی آہیں نہیں بھریں ہوں گی جتنا دھواں نوابزادہ صاحب نے جمہوریت کی یاد میں اڑایا ہے۔ وضع دار، شریف، متواضع، خلیق ذہین، تدبیر، دھن کے پکے، قول کے سچے، طبیعت میں درویشی، مزاج میں دراندیشی، خاندانی اعتبار سے ریش ابن ریش، لیکن نہ عزت نہ تکبر جیسا ملا پہن لیا۔ جو ملا کھا لیا۔ شکایت کسی کی نہیں کرتے۔ حکایت لہو لے نہیں کتہ ناز سراپا نیاز، دل میں گداز، سینہ پُر داند۔ پرانے لباس میں نپا انسان۔ ٹوپی تحریر خلافت کی یادگار، اچکن مسلم مٹی، کوثر اور شلوار دونوں جاگیر دار، جوتی نوابی، چوری ہو جائے تو رعایت ہے میں رہنمائی نہ کرنا کچھ ہوا، دھن کھلا ہوا، خطابت کے نزدیک

سے نہیں گزرتے۔ سیاسی تاش میں تڑپ کے پتے لگاتے وقت کھلاڑیوں کی ذہانت سے آنکھیں چاؤ کر لیتے ہیں۔ "ہواڑ کی پرانی بستیوں کے باعث خوش فہم عجیب ہیں نہ عجیب ہیں..... ذباں مٹی، لہجہ شستہ، گالی کے نام ہی سے نا آشنا۔ فارسی کے رسیا، اردو کے خدائی، انگریزی میں اتارو۔ سواد خط انتہائی خوبصورت۔ ماتھے پر تھید سے کی تمکنت، آنکھوں میں غزل کا سرور، دل آئینہ، نہ کسی کو محبوب کرتے نہ کسی سے مرعوب ہوتے ہیں جاگیر داروں کی ایک بھی ردا کھی بڑائی ان میں نہیں۔ شاس بازار کے مسافر نہ اس بازار کے راہی۔ شب و روز سیاسیات ہی کا سفر کرتے ہیں۔"

اور آج کل بھی سیاسیات کی راگداز پر ہیں۔ ان کی ذہانت و فطانت مختلف مزاج اور مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے سیاسی برہمنوں کو دو مرتبہ ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کر کے اپنا سکھ منوا چکی ہے۔ ایک دفعہ الوبنی دور میں گول میز کانفرنس کے موقع پر اور دوسری دفعہ تحریک ختم نبوت کے وقت۔ نام و نمود کی خواہش نہ پہلے تھی نہ اب ہے ورنہ وزارت و وزارت ان کے گھر کی لونڈی ہوتی۔ وضع آری اور اصول پرستی کو آج کل کی عوامی سیاست میں دیکھنا چاہتے ہیں مگر ملتی نہیں۔ نوابزادہ صاحب کی حب الوطنی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

حج ہر کہ شک آورد کافسر گردد

وہ سونا نہیں کندن ہیں۔ بعض نائٹے قد کے سیاسی مخالفین نوابزادہ صاحب پر پلٹن توڑتے ہیں کردہ برصغیر کی تقیم کے وقت مجلس ہواڑ میں تھے اور مجلس ہواڑ

پاکستان دشمن جماعت تھی مگر یہ ان لوگوں کا دماغی کوڑھ بن ہے۔ حیرت
 اس وقت ہوتی ہے جب وہ سیاسی نابالغ ان کے منہ سے ہیں جو برصغیر
 کی تقسیم کے وقت ہنگوڑے میں تھے یا جن کے آباء انگریز بہادر کی انگوٹھی
 کے ٹھینے تھے۔ بے خاک مجلس احرار نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی
 یہ سیاسی اختلاف یا مخالفت منزل مقصود کے بارے میں نہیں تھی۔ بلکہ
 حصول منزل کے طریق کار کے بارے میں تھی۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ انگریز
 کے ہاتھوں اقتدار حاصل کیا جائے جبکہ مجلس احرار کی یہ خواہش تھی کہ
 پہلے انگریز کو نکالا جائے اور انگریز کو برصغیر سے نکالنے کے لئے اس ایثار
 پیش جماعت نے جو جانی اور مالی قربانیاں دیں وہ ہماری تاریخ سربانی
 و استقامت کا ایک عظیم باب ہے جس سے تاریخ کا کوئی طالب علم صرف
 نظر نہیں کر سکتا۔ امیر شریعت نے قبل از آزادی مجلس احرار کے نقطہ نظر کی وضاحت
 کرتے ہوئے فرمایا: ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی ہو۔
 اس ملک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا نکالے جائیں تب دیکھا جائے گا کہ
 آزادی کے خطوط کیا ہوں گے۔ میں کوئی دستوری نہیں پا رہی ہوں۔ تمام عمر
 انگریزوں سے لڑنا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں کوئی بھی میری مدد کریں
 تو میں ان کا منہ چوم لوں۔ میں تو ان چیمبروں کو شکر کھلانے کو تیار ہوں جو
 صاحب بہادر کو کاٹ کھائیں۔ جب پاکستان بن گیا تو مجلس احرار نے
 اُسے نہ صرف دل و جان سے تسلیم کیا بلکہ اپنی سیاسی غلطی کا اعتراف بھی
 کیا۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا صرف عظیم لوگوں کا وارث ہے۔ جب خان لیاق علی

غلام مرحوم کے زمانہ میں ملکی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوا تو احرار مسلم لیگ کے دست و بازو بن گئے یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کی سب سے بڑی خود ساختہ جماعت کے امیر نے کشمیر کی جنگ کو جہاد ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ کشمیر کے محاذ پر شہید ہونے والوں کو شہید ماننے سے بھی منکر ہو گئے۔ امیر شریعت نے بیات علی غلام مرحوم کی حمایت میں پورے ملک میں طوفانی دورے کئے منافقین نے احرار اور مسلم لیگ میں تفرقہ ڈالنے کے لئے تحریک پاکستان کی مخالفت کا طعنہ دیا تو امیر شریعت نے فرمایا میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ میں نے پوری قوت سے تحریک پاکستان کی مخالفت کی۔ دیانتداری سے کی کیونکہ ہم ایسا ہی سمجھتے تھے۔ قوم لے ہمارے نقطہ نظر کے خلاف فیصلہ دیا۔ اب پاکستان کی تشکیل کے بعد ہمارا تعداد دشمنان پاکستان سے ہے اور میں انتشار پسندوں کو وارننگ دیتا ہوں کہ ان کا تعداد صرف بیات علی غلام سے نہیں بلکہ بخاری اور اس کی پوری جماعت سے ہے..... بخاری صرف اپنی نہیں بلکہ اپنے ہزاروں رضا کاروں کی جان دیکر بھی پاکستان کو مضبوط بنانا خیر سمجھتا ہے (لاہور، مئی سنہ ۱۹۵۷ء)

اور سنہ ۱۹۵۷ء میں ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "تم میری رائے کو خود غرضی کا نام نہ دو۔ میری رائے بارگشی اور اس کہانی کو نہیں ختم کرو۔ اب پاکستان نے جب بھی پکارا اور اللہ بالہ میں اس کے ذریعے ذریعے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس کی طرف کسی نے آنکھ اٹھائی

تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔۔۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے۔“

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ذکرِ خیر (زبازادہ نصر اللہ خاں کی سیما کا ہو رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زبازادہ صاحب اپوزیشن کے ماتھے کا جھومر ہیں مگر اقم المحدث کے نزدیک ان کی یہ سیاسی حیثیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اولیت ان کی لادینی حیثیت کہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ زبازادہ صاحب فارسی کے خوش گو شاعر بھی ہیں اور نامہ مخلص کرتے ہیں جس طرح عام سیاست دانوں کے برعکس تقریر بہت کم کرتے ہیں اسی طرح عام شعراء کے برعکس شعر سنانے میں بھی بہت خست سے کام لیتے ہیں یا ان کہیں کا مجمع ہو حقے کی نئے منہ میں ہو کوئی شعر سنانے کی فرمائش کرے اور زبازادہ صاحب ازراہ کرم اپنا شعر سنا دیں تو اور بات ہے بصورتِ دیگر ان کا کلام کسی اخبار یا رسالے میں نظر نہیں آئے گا۔ امیرِ شریعتؒ کے مجموعہ کلام بعنوان ”سوالح الالہام“ میں شاہ جیؒ کے فرزندِ ارجمند سید ابذر بخاری نے لوابِ زادہ صاحب کی ایک غزل نقل کی ہے جس کا شاہینِ نزول یہ ہے کہ امیرِ شریعتؒ کے ایک قطعہ پر لوابِ زادہ صاحب نے فی البدیہہ یہ غزل ایذا دفرمائی مثلاً جی کا قطعہ اور زبازادہ صاحب کی غزل بزرگوں کا تبرک سمجھ کر شیعے اور مسرورہ نے شاہ جیؒ کا قطعہ یہ ہے۔

بخت اگر مٹا شود، دست دہد سب سے خوش
از نگہ سمن برے، لالہ رخے، نگوئے خوش
بارغ و بہارِ ماندیم یعنی کہ جنت النعیم!
روئے خوش است دختے خوش، لبتے خوش دگلے خوش

اور اب لڑا اب زاوہ نصر اللہ خاں ناصر کی غزل ملاحظہ ہو۔ خیالات کی
بند می، تشبیہات کی غدت، ٹنگائی، موتی بھر، بڑے ہیے مصرعے اس
بات کے متقاضی ہیں کہ انہیں چودھویں صدی کا ناصر خسرو کہا جائے۔

گر چہ فلک بانی دہد، فرصت آرد دوسے خوش
کیف بہار در خزاں، داد خیالِ رُوئے خوش
غرض پائے نازِ او، برق لگن بقل دہرِ خوش
خیز بگلستانِ کنیم، خورش باؤ ہوئے خوش
سیر در نور شد، موج زباں ز قلمِ اش
برق بجانِ عاشقی، می فتد از گلوئے خوش
لبہ ہنر در نظر، رقص کُناں ہی روم
روغہ دلنوازاؤ، خانہ خوش بکُئے خوش
سید بارامیر، دوش بوجہ خوش بخواند
بخت اگر مٹا شود، دست دہد سب سے خوش
ناصر خسرو دل بیا، جانِ جہان من نگر
”روئے خوش است دختے خوش، لبتے خوش دگلے خوش“

گنبد سبز نظرِ رقص کناں بھی روم والا شعر بار بار پڑھتے اور بتاتے۔ کہ آیا
نوابزادہ صاحب یہ عقیدہ شعر کئی غزلوں پر بھاری نہیں ہے اور کیا یہ دل کے
تاروں پر مضراب کا کام دے کر ارتعاش پیدا نہیں کرتا؟
نوابزادہ صاحب کو تقریر کرتے سنا ہے ان کی تقریر سیاسی کم ادبی زیادہ
ہوتی ہے۔ سیاسیات کے غارِ زار میں ادب کی چمن بندی کر کے گہمائے رنگا
رنگ کھلا لانا پختہ ہے۔ یادش بخیر مرحوم ایوب خاں کے بھائی سردار بہادر علی
خاں نے بھی باغ و بہار طبیعت پائی ہے۔ سیاسیات کو طلاق دینے سے قبل
قومی پہلی میں، اپنے بر محل اشعار سے شکستہ میں رنگینی پیدا کرتے تھے ایک شعر
ذہن میں جھول رہا ہے آپ بھی سن لیجئے۔

ہر شاخ پہ آواز بٹھا ہے
انجام گلستاں کیا ہوگا

مگر مبداء فیض نے شعر فہمی اور بر محل شعر گوئی کا جو ٹکڑا نوابزادہ صاحب کو عطا کیا
ہے اس میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔ عثمان میں پندرہ منٹ کی ایک تقریر
میں انہوں نے اوسط دس شعر سنائے۔ آپ کے نزدیک اگر یہ مبالغہ آرائی ہے
تو میں دہرائے دیتا ہوں آپ گنتی کر کے میری تصدیق کیجئے۔

۵ فضا سے بدر پیدا کرو، فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی
۵ سلیقے کشی کا ہوتا کر لیتی ہے محفل میں،
نگاہِ مست ساقی، مفلسی کا اعتبار اب بھی،

۵ نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
 کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے ،
 ۵ غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
 کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا
 ۵ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
 دامن یار! حند اڑھانپ لے پرہ تیرا
 ۵ زلفِ عنبر بارے کثر دم بکھیرا ڈور بھگال ،
 ۵ نیند اُس کی ہے راتیں اس کی ہیں داغ اسکا ہے
 جس کے بازو پر تیری زلفیں پریشاں ہوئیں
 ۵ خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے گیونڈ بڑھے
 حُن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
 ۵ دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
 جب تک شراب آئی، کئی دور ہو گئے

حیوان ظریف غالب نے کہا تھا کہ حجِ حدیثِ دل با اہلِ دل گو
 تو کیا ادبیات کے طالب علم جو سیاسیات پر تین حرف بھیجتے ہیں نوابزادہ صاحب
 سے یہ عرض کر سکتے ہیں کہ وہ سستیا کا پنڈ مچھوڑ دیں اور ادب کے دامن میں
 پناہ لیں کیونکہ سیاسیات تو ادبیات کی ایک ادنیٰ کنیز ہے اور اب تو عوامی
 ہو کر کنیز سے بیوا ہو گئی ہے +

قافلہ بخاری کے ایک سالار

مولانا تاج محمد لاہوری

یہ لوگ بھی اٹھ جائیگے، اس پر دم دھاسے
تمڑھونڈنے نکلے گئے مگر پائے سکو گئے

بلند قامت، قدرے بھاری جسامت، گندمی رنگت، گول چہرہ، بھرداں
داڑھی، تراشیدہ مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی۔ بڑھاپے کے
باوجود چہرے پر جھڑیوں کا نام نہ نشان، نمی اچکن اور کرتہ شلوار زیب تن کئے،
سر پر جناح کیپ جمائے، ایک صاحب مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کی اسٹیج
پر براجمان کئے۔ اسٹیج سے کافی دور ہونے کے باعث میں نے انہیں
مولانا ابوالحسن قاسمی سمجھا جو مدرسہ تعلیم الابرار ملتان کے مہتمم اور محضنت مولانا
احق الحق نقاوی مدظلہ کے پجاری ہیں۔ حیران تھا کہ آنجناب نے کیسے
یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ یہ حیرانی جاتی رہی جب برادر مہیب
بشالوی نے بتایا کہ یہ مولانا تاج محمد لاہوری ہیں۔ دلی خوشی ہوئی کہ آج
قافلہ بخاری کے ایک سالار کی زیارت ہو گئی۔

مولانا یوم شہدائے ختم نبوت کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے جب ان کی باری آئی تو میں سراپا گوش تھا۔ انہوں نے مولانا یوسف بنوری دہلوی برکاتہم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا حضرات! میں اس لاکھ نہیں کہ حضرت بنوری مدظلہ العالی کی موجودگی میں تقریر کر سکوں۔ اصل موضوعاتی تقریر تو تقریرِ شیریں بیاں بھائی عبدالشکور دین پوری کی تھی جنہوں نے مخصوص انداز میں بھی آپ سے خطاب کیا یا میرے بعد حضرت بنوری مدظلہ کی ہوگی۔ میں تو چند معروضات پیش کرنے کے لئے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ ہماری زندگی موت کا مسئلہ — ایک صدی کا مسئلہ جو اسلام کی روشن چٹائی پر برص کے داغ کی حیثیت رکھتا تھا عوام کے تعاون، علمائے کرام کے اتحاد اور وزیراعظم پاکستان مشرف العظمیٰ علی بیٹو کے تدبیرے آئینی طور پر حل ہو گیا ہے۔ آپ سب لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں مگر میری نظر میں اصل مبارکباد کے مستحق وہ لوگ ہیں جنہوں نے ختم نبوت کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

سہ بنا کردند خوش رستمی بخون دغاک غلطیدن،
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت

سلسلہ ۱۹۵۳ء میں دس ہزار کے قریب مسلمان شہید ہوئے تھے اور سلسلہ ۱۹۵۴ء میں بھی تیس مجاہدوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اس مرتبہ بھی مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر نے اس طرح باہمی یگانگت کا ثبوت دیا جس طرح سلسلہ ۱۹۵۳ء میں دیا تھا۔ اس اتحاد کی نفی کو بہر حال اور بہر قیمت برقرار رہنا چاہئے۔ خدا نے

یہ شرف احرار کو عطا فرمایا کہ اس نے صدیوں کے بھڑے ہوؤں کو گلے ہوا دیا۔ دشمنوں نے اجداد میں اس مسئلے کو احراری اور قادیانی مسئلہ بنا کر پیش کیا حالانکہ یہ اسلام اور کفر کا مسئلہ تھا۔ جب ۱۹۵۲ء میں دستور کے راہنما مول مرتب کئے گئے اور اس میں قادیانیوں کو مسلمانوں کے کھاتہ میں ڈالا گیا تو امیر فریقیت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اس کے مہلک مغفرت سے قوم کو آگاہ کیا۔ مولانا محمد علی جالندھری مرحوم کو جو اس وقت لاہور میں مقیم تھے، خط لکھا اور تلقین کی کہ وہ دیگر مکاتیب فکر کے راہنماؤں کو ایک پلیٹ غلام پر جمع کرنے کی سعی کریں۔ چنانچہ مولانا جالندھری سب سے پہلے مولانا ابوالحسنات کے پاس گئے اور عرض کی: ”مولانا! میری نظر میں آپ کی تین حیثیتیں ہیں، جن کی بنا پر آپ کے دروازے پر چل کر آیا ہوں۔ اولاً آپ اکثریتی فرقے کے مسلمہ راہنما ہیں۔ ثانیاً لاہور میں آپ کا حلقہ اثر سب سے زیادہ ہے۔ ثالثاً آپ آل رسول ہیں۔ بنا بریں آپ سے القاس کرتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ مسئلہ ختم نبوت کے سلسلے میں تعاون فرمائیں۔“

مولانا ابوالحسنات کی قبر پر خدا ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ پہلے صاف انکار کر دیا اور فرمایا: ”میں تم دیوبندیوں سے تعاون نہیں کر سکتا۔“

مولانا محمد علی نے پختہ آباد لا، جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے میں جا رہا ہوں۔ ہم نے سب سے پہلے جماعتی سطح پر نبوت کے سارقین کا تعاقب کیا تھا اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ مگر یہ یاد رکھیں کہ کل میدان حشر میں شافع محشر کا دامن تھام کر عرض کروں گا کہ اے اللہ

کے رسول! میں آپ کی نبوت کی حفاظت کے لئے ابراہیمؑ کے پاس
چل کر گیا تھا مگر انہوں نے مجھے شکر ادا کیا تھا۔ یہ مسئلہ دیوبندی، بریلوی، احمدی
اور شیعہ تہنیتی کا مسئلہ نہیں۔ یہ اسلام اور کفر کا مسئلہ ہے۔ آج آپ انکار کر
سہے ہیں کل شافعہ حشر کو کیا جواب دیں گے۔۔۔۔۔ مولانا جان حشر اپنی
بات پوری نہ کرنے پائے تھے کہ مولانا ابراہیمؑ کے دوڑ کر لپٹ گئے اور
فرمانے لگے: بھائی محمد علی! تم امیر شریعت بخاری کو جا کر کہہ دو کہ وہ جب
اور جہاں فرمائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔

اسی طرح دیگر مکاتیب فکر کے راہنماؤں نے بھی امیر شریعتؒ کی
آواز پر لبیک کہہ کر وحدتِ نبویؐ کا ثبوت دیا۔ جس سے قادیانی سہم گئے۔ مگر
اس وقت کی بد بخت حکومت نے تحریک کی کامیابی سے بڑھ کر تشدد کا
سہارا لیا۔ ہزاروں سہاگنوں کے سہاگ لٹ کر، ہزاروں بچوں کی گودیں
خالی کر کے وہ سمجھے کہ مسئلہ حل ہو گیا مگر چند دنوں میں خمیدہ دل کا خون رنگ
لایا۔ نہ ناظم الدین برسرِ اقتدار رہا نہ دولتانہ۔

میر کارواں امیر شریعتؒ، خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ
مبلغ اسلام مولانا لال حسین اختر، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری
اور مولانا محمد علی جانہ حشری رحمۃ اللہ علیہم جمعین کے اکٹھے جانے سے
سہم لوگ نڈھال ہو گئے تھے۔ ایک خدائے ایک رسول اور ایک کتاب
کو ماننے والے پھر فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک فرقے کا مسلمان
اگر دوسرے فرقے والوں کی مسجد میں نماز ادا کر لیتا تو مسجد کو دوبارہ پاک

کیا جاتا۔ کوئی ایسا رہنما نظر نہیں آتا تھا جو فرقوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کو پھر ایک مرکز پر لا کھڑا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا اور مولانا محمد یونس پوری مدظلہ جیسے گوشہ نشین بزرگ میدان میں کود پڑے اور ہم سخت سہارا ملے۔ سامانوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ مگر یہ کامیابی اور حوری ہے جب تک کہ قومی اسمبلی کے فیصلہ کے مطابق

(۱) قادیانیوں کو کلیدی عہدوں سے نہیں ہٹایا جاتا۔
(۲) ان کے پاسپورٹوں اور شناختی کارڈوں پر غیر مسلم کا لفظ لکھنا نہیں کیا جاتا اور

(۳) ان کی عسکری تنظیم پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔
ہمارا قافلہ منزل مقصود کو پہنچ چکا۔ اب ہم چراغ سحری ہیں میں ایک طرف تو حکومت کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ وہ قادیانیوں کی اندرونی ریشہ دانیوں پر کڑی نظر رکھے۔ قادیانیوں کو بھتہ خوار کی طرح کشاکش رہا ہے۔ پاکستان میں جب بھی فوجی بغاوت ہوتی اس میں کمیونسٹوں کے ساتھ قادیانی بھی شریک تھے اور آئندہ خدا نخواستہ ملک کو ختم کرنے کی کوششیں کرنے کی کوئی سازش ہوتی تو بیرونی طور پر بھارت اور روس کا ہاتھ ہو گا اور اندرونی طور پر کمیونسٹوں اور قادیانیوں کا۔

دوسری طرف عوام کو نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اس اتحاد کی فضا کو برقرار رکھیں کیونکہ بیرونی دشمنوں نے چار قومیتوں کا نعرہ لگا کر ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی اس سادہ کے اندھے اور اس کے دلائل

کو اپنے ملک میں بسنے والی درجنوں قومیں نظر نہیں آتیں اور اندرونی دشمن
نے اس محرم الحرام کے موقع پر شیعہ سنی فساد کو اسلئے کی بھرپور کوشش کی کہ پکو
یاد ہو گا کہ قومی اسمبلی کے اس تاریخ ساز فیصلہ پر جب اخبار نویسوں نے
مرزا ناصر احمد قادیانی کو تبصرہ کرنے کے لئے کہا تو وہ ٹال گئے۔ جب
اعتراف ہوا تو اس نے کہا تھا کہ وہ جنوری میں اس فیصلہ پر تبصرہ کریں گے۔
جنوری میں محرم الحرام آ رہا تھا اور ان کے ذہن میں شیعہ سنی فساد کرانے
کا نقشہ موجود تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔
اپنے آدمی شیعہ فرقہ میں داخل کرائے۔ اپنے آدمیوں کے علاوہ چند لوگوں کو
کو سرائے کے بل بوتے پر خرید بھی گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں ناکامی کا منہ
دیکھنا پڑا۔ اندرونی اور بیرونی خطرات کے پیش نظر تمام مسلمانوں کا اتحاد
وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے اور ہر مسلمان کو اس کے لئے کوشش کرنا
چاہئے۔ وما علینا الا البلاغ

یہ کتنے قافلہ بخاری کے ایک سالار۔ ہفت روزہ ٹولاک لائپور کے
مدیر، زبان اردو کے تیسرے شمع بزم رسالت کے پرستار، اسلام کی تبلیغ
جو ہزار اور فن خطابت کے شہسوار۔ مولانا تاج محمد لائپوری

مولانا کوثر نیازی

۵

معنی ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے

کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

ہمال جبریل میں اقبال علیہ الرحمۃ کا یہ شعر بار بار پڑھتا تھا۔ مگر تشریح
دفعہ پہلی دفعہ مولانا کوثر نیازی کی زبانی عید میلاد النبی کے موقع پر، اسلامیہ
ہائی سکول عام خاص باغ دستان میں سنی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دریا سے معانی
میں طوفان آگیا ہے۔ اپنے موضوع کو قرآنی آیات، احادیث نبوی اور
کلام اقبال سے اُجالتے اور مچھالتے چلے گئے۔ مولانا کی خطابت کے
سحر کے زیر اثر، مرحوم مجلس ایمنہ آرکیائی کے اس دعویٰ پر ایمان لانا پڑا کہ
اقبال کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے پڑھنے والوں کے علاوہ
سننے والوں کو بھی باوجود ہونا چاہیے۔

مولانا کی پہلی تقریر سنانے کے لئے ایک دوست زبردستی گھسیٹ کر لے
گیا تھا پھر دستان میں مولانا کی شاید ہی کوئی تقریر ہو تو راقم الحروف نے نہ سنی ہو
ابتر وہ دوست ساتھ چھوڑ گیا کیونکہ مولانا جماعت اسلامی سے ٹکھنے کے بعد
ان کی نظر میں نہ مولانا، کہے تھے نہ غلام اور شاید نہ ہی مسلمان۔

اکثر مقرروں کو دیکھا اور سنا ہے وہ اپنے مقررہ وقت کا زیادہ حصہ تہیید
باندھنے سفر کی تکالیف کا ذکر کرنے اور ناسازی طبع کا ردنا روئے میں صرف کر
جاتے ہیں یا پھر تنظیم جلسہ کا اصرار اپنا انکار اپنی نامعلوم مصروفیات کا اظہار
اور بلاخر عوام کے پیار کا ذکر کر کے اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔ مگر مولانا
کوثر نیازی میں یہ بات نہیں وہ ابتدائی رسمی جملوں کے ساتھ ہی اپنا بیان شروع
کرتے ہیں۔ موضوع ہر گھڑی ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ تقریر نہایت چمکیلی
اور فی البدیہہ کرتے ہیں۔ خود سادہ منکر اسلام کی مانند تقریر کے لوش سامنے
نہیں رکھتے۔ چونکہ شاعر ہیں اس لئے ان کی تقریر میں نظم کی وحدت کے ساتھ
ساتھ غزل کی رنگینی بھی ہوتی ہے۔ الفاظ کی ندرت، خیالات کی بلندی، مد
سے وابستگی اور ادب عالیہ سے شغف ان کی تقریر کے عناصر اور اجزاء ہیں۔
ہر حلقہ اور ہر کتب فکر میں نہایت خوب و احترام سے بٹتے اور سنے جاتے ہیں۔
بطل حریت، شہباز خطابت، آغا شورشش کا شمیری نے اپنی عمر کا بڑا حصہ
قید و بند میں گزاریا ہے۔ نئے زمانے میں پرانی باتیں سننے میں ان کا جواب
نہیں۔ وہ اس دور میں بھی قید و بند اور قربانی و استطاعت کو کھوٹے کھرے
کے پرکھنے کا معیار گردانتے ہیں۔

کبھی ادبوں اور شاعروں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ کبھی صحافت کی خانہ ویرانی
پر سوز غانی کرتے ہیں اور کبھی ڈرامنگ روم کی سیاست پر ایمان رکھنے والے
سیاستدانوں کو قربانی اور استقامت کی راہ دکھانے کے لئے نثر زنی کرتے
ہیں۔ انہوں نے چند سال پیشتر مولانا کوثر نیازی کے بارے میں تحریر کیا تھا کہ

آغا صاحب کی پیشگوئی یحییٰ دور حکومت میں پوری ہو گئی جب مولانا کو ان کی تقریر و تحریر سے زچ ہو کر پابند سلاسل کر دیا گیا۔ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کے ذمہنی اُنہی کی داد دیجئے کہ انہوں نے مولانا کے پابند سلاسل ہونے کے باوجود قصور کے حلقہ سے انہیں اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ عوام نے جس جوش و خروش سے مولانا کو کامیاب کر دیا وہ ان کی عقیدت کا اعلیٰ اظہار تھا۔ یہ صرف پاکستان کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا کہ ایک قیدی امیدوار کو ووٹروں نے واضح اکثریت سے کامیاب کر دیا۔ مولانا نے غالباً پیپلز پارٹی کا میاب امیدواروں میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی تھی، اور یحییٰ گورنمنٹ کو بھی عوام کے سامنے ہتھیار ڈال کر انہیں رہا کرنا پڑا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے تمام حکومت سنبھالی تو مولانا کو مرکز میں اہم وزارت وزارت اطلاعات و نشریات (وفاق و جج) سونپی۔ آج کل مذہبی امور کا محکمہ ان کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وزارت کو انہوں نے نہیں چننا بلکہ وزارت نے ان کے انتخاب سے روٹی پائی ہے۔ پیپلز پارٹی کے ان چند رہنماؤں میں سے ہیں جن کی آواز پارٹی کے اندر پولیٹیشن اور عوام میں احترام سے سنی اور مانی جاتی ہے۔ مولانا اس وقت بھی ہر دلعزیز تھے جب کسی دل میں ان کے در پر فتنے

کا خیال بھی نہیں تھا اور آج بھی عوام میں مقبول ہیں اور مقبولیت کی وجہ ان کی عوام دوستی ہے۔ وہ عوام کے مقابلہ میں وزارت صدارت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ نشان میں رابطہ عوام کی مہم کے دوران فرمایا: میں جب ایک رسالے کا مدیر تھا تو بھی آپ کا تھا جب اسیر تھا تو بھی میرا دل آپ کے دلوں کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور اب جب کہ میں وزیر ہوں تو بھی آپ کا ہوں۔ آپ آزما کر دیکھیں۔ آپ مجھے اپنے سے جدا کبھی نہ پائیں گے۔

کوثر نیازی مولانا غفرور ہیں مگر محض کٹھن ٹلا نہیں۔ شاعری نے مذاق مزاح میں غزل کی رنگینی پیدا کر دی ہے۔ غزل کہتے ہیں اور درغل ان کی غزل گوئی پر دال ہے۔ نعت گوئی میں بھی بند نہیں۔

اردو کے بانی ادیب ہمدی الافادی کو خدا اجانے کس مولوی سے رابطہ پڑا تھا کہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں: مولویوں میں طرف نہیں ہوتا۔ ذرا آزمائش پڑی یہ دل چھوڑ بیٹھے۔ ماضی کی نہیں حال کی بات کرتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں صبر و استقامت کے پہاڑ دیکھے ہیں۔ مولانا عبید اللہ اقرہ ظفر مولانا عبید اللہ شکور دین پوری اور مولانا کوثر نیازی۔ مولانا عبید اللہ اقرہ کے صبر و استقامت کی گواہی لاہور کے شاہی قلعہ کے درویش اور دیں گے۔ مولانا عبید اللہ شکور دین پوری کے جواں سال فرزند ارجمند چند دلوں میں دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نشان میں نماز جمعہ کے وقت جب لوگوں کو خود بتایا تو لوگوں کی ہچکچاہٹ بند گئیں۔ جواں کی موت نفی۔ پتھر بھی گھسل گئے۔

گر پیر مرد تو سالہ بیزوغے نیست
ایں ماتم بخت است کہ گوید جواں مرد

مگر مولانا کی زبان پر صبر و شکر کے کلمات تھے۔ آہ وزاری کا نام نہ تھا اسی طرح مولانا کو نیا زلی کے جواں سال فرزند فاروق نیا زلی ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو کر داغ مفارقت دے گئے۔ ملک کے ہر گوشے سے لوگ تعزیت کے لئے آئے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی مگر مولانا صبر و استقامت کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ آہ و بکا کا نام نہ تھا۔

سُرخ، سفید رنگت، سر و قامت، چہرہ پر جسامت، گول چہرہ، ہتھوڑا ناک، سفید دانت، ہونٹ گلابی، آنکھیں شرابی جہیں نظر سے بچانے کے لئے منہ سے فریم کی سفید فیشے والی عینک چڑھائے رہتے ہیں۔ دائرہ کا حاشیہ جس سے چہرے کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ عام طور پر سنبلہ اور کرتہ اور جیکٹ یا شیر ذاتی پہنتے ہیں۔ سوٹ بٹ پہننے سے بھی انکار نہیں جنت یہ ہے کہ ہر لباس میں تصویر ہیں۔ میاں والی میں پیدا ہوئے۔ لاہور آکر پران چڑھے حتیٰ کہ لاہور کے ہو کر رہ گئے۔ ہر محفل کی زینت اور ہر مجلس کی جاں نثار اور آج کل اسلام آباد کی رونق بڑھائے ہیں۔ زندگی کے اداس لمحوں میں ان کا یہ شعر اتم الحروف کے درد زبیاں ہوتا ہے اور جو صمد دلاتا ہے وہ مل نہ سکے یا تو ہے اٹن کی سلامت! اس یاد سے بھی ہم نے بڑا کام لیا ہے،

کلیم وقت شورش کاشمیری

جہاں ضمیر سر دشی کا بول بالا ہو
جہاں ہوں بہت خصائل متع کر دار
جہاں درد غ فیضیت جہاں ہو چل و تار
جہاں پر قوت و جبروت کی نمائش ہو
جہاں دقار بشر صرف زار پرستی ہو
جہاں اثر ہو فغاں کا نہ ہمت فرمایہ

جہاں پر غلبت شب لا قہب بالا ہو
جہاں عقاب ہو کر گس کا جاشیر بردار
جہاں ہو لوریا با فوں کا مستقل بازار
وفا شعار کی ہر وقت آزمائش ہو
زبان خلق خدا بات کو ترستی ہو
جہاں صلہ ہو صداقت کا صرف اقتدار

تو وجود وہاں حوصلہ بڑھاتا ہے

چراغ شب کی طرح راستہ دکھاتا ہے

ورق ورق سے نمایاں ہے تیرا زور بیاں
تو بیاض سے روشن ہو علم و فن کا عرس
بھنور ہزارا ہی درمیان بحر مگر
کلیم وقت ہے اپنے عصا پر تکیہ کر
قدم دریغ مدار از لذارش احوال
کہ تو نے دقت اسی ملک گذار ہے

تو سیل فکر ہے جس کا شہید ہوا ہے
توے فکر سے تری ذات آشکارا ہے
بھنور کا آخری انجام تو گناہ ہے
عصا سے تھوٹی بیانی تو اہار ہے
کہ تو نے دقت اسی ملک گذار ہے

مثالی حضرت عیسیٰؑ جواب ہے ٹپک

کہ تجھ کو دقت نے اک بار بھر بھار ہے (انور ہدیہ خیال اردو)

کلیم وقت، شہیدِ خطابت اور اقبال کا شاہین آغا شورش کا شمیری

عام ہے چاروں طرف ذریتِ ابنِ زیاد
میں ہوں پاکستان کے کوفہ میں دربانِ حسینؑ (شورش)
سر رہے :- آغا شورش کا شمیری کا قلمی خاکہ سب سے پہلے
ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۶۶ء میں چھپا۔ یہ راقم کی
آغا صاحب سے پہلی ملاقات تھی اور یہ قلمی خاکہ راقم الحروف کی
پہلی ادبی کوشش۔ دس گیارہ سال کے طویل عرصہ میں آغا صاحب
مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر اور کھل کر اور کھل کر سامنے آئے ہیں
مطالعہ کی نئی راہیں کھلی ہیں۔ نتیجتاً یہ قلمی خاکہ قدرے عکس و
افاضہ کے ساتھ دوبارہ پیش خدمت ہے۔ (عبدالعزیز)

اب سے چند برس اُدھر کا ذکر ہے کہ آغا صاحب مدرسہ قاسم العلوم کے
سالانہ جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے تشریف لائے۔ ہمارے میزبان کے اہتمام
ہوئے تھے جس شب انہوں نے خطاب کرنا تھا اس سے اگلی صبح انگریزی

کا پرچہ تھا۔ آنکھیں کثرت مطالعہ کے باعث دکھ رہی تھیں مگر ایک نامعلوم
 سا جذبہ تھا۔ ایک نامعلوم سی اُمنگ تھی جو مجھے مطالعہ کے کمرے سے اُٹھا
 کر باغ لانگے خاں کے پنڈال میں لے آئی۔ بھلا میں اس شخص کی تقریر
 کو کیونکر گنوا دیتا جس کے اسلوب نگارش نے مجھے اس کا دیوانہ بنا رکھا تھا
 آغا صاحب نے آٹھ بجے خطاب کرنا تھا مگر یہاں چھ بجے سے یہ حالت تھی
 کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پنڈال تو رہا ایک طرف تمام باغ و گولوں سے کچا کچ
 بھرا ہوا تھا اور ابھی لوگ شہر کے ہر گوشے سے اُٹھ رہے تھے، بریلوی تھے
 ان میں بوڑھے، ادھیر عمر، جوان بچے بھی تھے۔ دیوبندی تھے، بریلوی تھے
 اہلحدیث تھے، پڑھے لکھے تھے ان پر دم تھے۔ عقیدت مند بھی تھے اور جان
 کے دشمن بھی۔ غرضیکہ انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہر
 عمر اور ہر فرقے کے لوگ دیکھنے میں آئے۔ باغ لانگے خاں کے قرب نے
 تقریر سننے کا چمک بچپن سے لگا دیا تھا۔ میں نے بتان کی تاریخ میں اتنا بڑا اجتماع
 کسی مقرر کے جلسے میں نہیں دیکھا۔ آغا صاحب وقت مقررہ پر احباب کے جلوں
 اینچ پر پہنچے۔ پندرہ بیس منٹ تک پنڈال مسلسل نعروں سے گونجتا رہا۔ جب
 جلسہ کی ابتدائی کارروائی کے بعد مائیکم انہوں نے سنبھالا تو لوگوں کا ہوش و غروش
 قابل دید تھا۔ دل کی دھڑکنیں حناٹ بنائی۔ سے رہی تھیں۔ مگر گرامی قدرگو کے
 جاندار الفاظ فضا میں گونجنے اور سنا نا چھا گیا۔ ان کی تقریر کیا تھی ایک ماحر
 گیت تھا جس سے ہمیں سرشار ہو رہی تھیں۔ ایک چشمہ صافی تھا جس سے ہر شخص
 بقدر استطاعت استغوا سیراب ہو رہا تھا۔ جذبات کا شعلہ جوالہ تھا جس کی تپش

تمام سامعین محسوس کر رہے تھے۔ اس میں توحید باری تعالیٰ کا بیسان تھا
خاتم النبیین کی مدح تھی۔ مسلمانوں کے عروج کی داستان تھی۔ موجودہ بے مانی
اور بے سرو سامانی کا فوج تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ جمال الدین افغانی
کے خواب کے خیر منہ تعبیر ہونے کا اظہار کاٹل بھی تھا۔ اس میں غزل کی
رنگارنگی تھی اور نظم کا تسلسل تھا۔ یہ ان کی خطابت کا سحر تھا کہ سامعین کے
دل ان کے الفاظ کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے
لوگ رو رہے تھے۔ غرضیکہ انہوں نے ارٹھائی گھنٹے تک لوگوں کو اپنے
زور خطابت اور جذبے کی سچائی سے مسحور رکھے رکھا۔

اس کا صاحب نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ ذلہ خواروں، انگریزوں کے
پشتینی رفاداروں اور ظفر علی خاں کے الفاظ میں "لڑائیوں کا دور تھا۔ تقریر
کے اقتدار کا سوجھ بوجھ نصف النہار پر تھا۔ انگریز یا اس کے ہوا خواہوں کے
خلاف زبان کھولنا، قید و بند کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر یہ ازل سے
سیماب کی طبیعت لے کر آئے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی صحبت اور اہللال
کے بالاستیعاب مطالعہ نے اس پر بیقل کا کام کیا اور وہ سولے سے کنڈن
بن گئے۔ "ہمد گنج کے قلمی سانچہ کے بعد مطلع پنجاب پر ایک خطیب بن کر
اُبھرے اور چھپا گئے۔ بڑے بڑے راہنماؤں سے خراج تحسین وصول
کیا۔ آغا ز جوانی میں کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں
مرحوم نے تقریر سے خوش ہو کر بیل پنجاب کا خطاب دیا۔ مولانا شوکت علی
نے ان کی تقریر سنی تو فرمایا۔ "جیتے رہو۔ اب ہمارا نہیں تمہارا زمانہ ہے...."

ماشاء اللہ خوب تقریر کی برصغیر کے سب سے بڑے خطیب امیر قریب
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے پہلی دفعہ ان کی تقریر سنی تو بے ساختہ فرمایا۔ معلوم
ہوتا ہے اس کے حلق میں گڑبڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آواز میں
غنا نہیں ورنہ ہم لوگ بھی چو کر دی بھول جاتے۔ پھر فرمایا۔ بھو اللہ، مطمئن
ہوں کہ بڑھاپا جوان ہو گیا ہے۔ میں برگہ کا درخت نہیں کہ اس کے نیچے
دوسرا لہو آگ ہی نہیں سکتا۔ شورش کا شمیری شمیری مراد ہے فخر علی غالب
موجود کو تمام عمر اپنے اس معنوی فرد پر ناز رہا۔ ۱۹۴۷ء میں فرمایا ہے
شورش سے میرا رشتہ ہے اور وہ لڈلی ہے

میں رقت کا رستم ہوں تو یہ ثانی سہراب

خطابت کی راہ سیاست کے خارزار میں لے آئی۔ بقول پرغیر محمد سرور
جامعی پنجاب کے جس تاریخی عہد میں شورش نے اپنی زندگی کا آغاز کیا،
آج ہم میں سے اکثر اس کا تصور نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ آج سامراج مردہ باڈ کے
نعرے لگانا بڑا آسان ہے۔ مگر جس زمانہ میں شورش لے اس صوبہ کی مشہور سراج
بغمن سیاسی پارٹی مجلس احوار کا ساتھ دیا، اس رقت سامراج مردہ باڈ کہنے
والے کو قید و بند میں جاتا پڑتا تھا۔ اور شورش نے قومی آزادی کی خاطر تقسیم
سے قبل دس برس قید کاٹی۔ راہنماؤں کی دعا اور ساتھیوں کی بے وفائی نے
اسے سیاست سے باغی کر دیا اور اسے کہنا پڑا کہ سیاست اس چیز کا نام ہے کہ
جس کے پہلو میں دل نہیں ہوتا اور نہ ایسے قافلے کے ارکان آپس میں ایک
دوسرے کے فدائی ہوتے ہیں۔ ان کی رفاقت جنت پہ اڑنے والی چنگول

کی مانند ہے جو آپس ہی میں اڑتی لڑاکیں ہیں کاشمی ہیں۔
سیاست طوائف کا پہلو نکلی تو آغا صاحب نے اس سے دامن چھڑایا
اور تاثیر، ناجور، اختر شیرانی اور سانکت مہروم کے اکسانے پر ادنیٰ لوب میں
قدم رکھا۔ پاکستان بننے کے بعد چٹان کا ڈول ڈالا چٹان کی ٹیوٹھانے
وقت کھڑے کلمہ الحق کو اس کا نصب العین (Motto) قرار دیا اور آج
ایک قوم سے کہتے ہوئے وعدے پر حرف نہیں آئے دیا۔ چٹان نے صحافت
کو ایک نیا روپ اور دیا نکھار عطا کیا ہے چٹان کی تحریریں شاہوں کے حکمت
اور غریب کی جھوپڑیوں میں کیساں توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس سے عوام
موصولہ پاتے ہیں اور شاہ پستاتے ہیں۔

خطابت و سیاست کے علاوہ ادب میں بھی ان کا ایک خاص مقام
ہے۔ راجن سستانش باہمی کے بے دین رائٹر، اپانج ادیب نہ مائیں
تو اور بات ہے جن کا اپنا وجود ہی محل نظر ہے، شورش کی نثر ابوالکلام آزاد
اور محمد حسین آزاد کی نثر کا پر کر ہے۔ ان کی نظم نظم علی غاں کی نظم ہے جس
سے قال اللہ اور قال الرسول کے سوداگر، قادیانی امت اور نازنینانِ سیاست
کے ماکھوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ وہ سیاست کو تیاگ چکے ہیں مگر سیاستدانوں
کے حکمران کی غلطیوں پر آڑ سے ہاتھوں لیتے ہیں۔ ان کی تنقید تحریریں نہیں تعمیری
ہوئی ہے جہاں اچھے اقدامات پر حکومت کی مدح کرتے ہیں۔ وہاں
بڑائیوں پر قسح کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ جہاں قصیدہ ہے وہاں خرم بھی
ہے۔ وہ صبح معنوں میں محب الوطن ہیں۔ ان کا کلام ابوالکلام کی طرح ہر خوانی

بھی کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مولانا محمد علی جوہر کی طرح مبارزت طلبی بھی کرتا ہے۔ حمید نظامی مرحوم کے بعد صحافت ان کی ذات پر جتنا بھی فخر کرے کہ ہے شورش کے قلم میں شک بھی ہے اور کمکت بھی۔ کتاؤ بھی ہے اور گھٹو بھی۔ پکتا بھی ہے اور طکار بھی ہے۔ ان کے نزدیک قلم کی حفاظت کرنا مال بہن کی عصمت کی حفاظت کرنا ہے مگر انوس اس بات کا ہے کہ اسے صحافت کی اس کو بائیں جس قبیلے سے واسطہ پڑا ہے اس میں سے بیشتر بڑھتے ہوئے کے پیاری ہیں انہیں عوام سے زیادہ اپنی ذات سے پیار ہے۔ شریفوں کی گویا اچھالی کرنا نہیں سکون ملتا ہے اور فحاشی کے قصے چلپ کر انہیں بھی راحت نصیب ہوتی ہے وہ آغا صاحب کے اپنے الفاظ میں محافی سے چھپنے ہوئے ہیں۔

صحیف کے از قبیلہ مجنوں نہ ماند

شورش کے بارے میں چہرہ کی رائے یہ ہے کہ وہ ابوالکلام ظفر علی خاں اور امیر شریعت بخاریؒ کی خلیبانہ بدگمانیوں کا ایک دلاویز مرقع ہیں۔ ان کے پاس ابوالکلام کی کوفت تسلیم میں دھلی ہوئی زباں دھو قبول پر و فیسر خید احمد صدیقی، پُرسش کی بجائے پرستش کی دعوت دیتی ہے، ظفر علی خاں کا طنز اور امیر شریعتؒ کی شگفتگی ہے ان کی زبان و بیان پر جس بایں۔ اسے رحمن کا یہ تاریخی فقرہ سند کی حیثیت رکھتا ہے جو انہوں نے ۱۹۶۶ء میں یوم اقبال کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ اس شخص کو زبان و بیان پر اس

قد فاما ما نحل ہے کہ وہ لوگوں کے دل و دماغ سے کیلتا ہے۔

مولانا عبدالمجید صاحب آبادی و صاحب دہ حسد کے جہلک مرض میں مبتلا نہیں تھے، نہ مولانا ابوالکلام کے لئے جماع الہیات و جماع الصلوات کی اصطلاح وضع کی تھی وہی ان پر لاگو ہوتی ہے۔ وہ ایک دشت ایک خلدہ جیاں غلیب، ایک بیباک اور شور مچانی، ایک ہندو جہد پیدہ گوٹا اور ایک صاحب طرز جویب ہیں مگر آج کل کے زمانے کے نصیب اور ادا دھور سے علم و اسلحہ ڈگری یاختے معاصرین اور خاصہ دین کے ٹوٹے ہیں۔ ان لوگوں میں یہ حوصلہ تو نہیں کہ سامنے آکر دار کوں الہیہ پیچھے ہٹیں گھولنے مار لے اور کونے، طعن توڑنے ابھری آنے سے ڈرا نہیں چوکتے اور ٹہری کی لغت ہماری نوی زندگی کا شمار ہوئی ہے اس کو ہم میں گئی عینوں کے مکرناؤں پر ملک کر اپنی مظلومیت کی داستان سامنے ہیں۔ آغا صاحب بھی ان لوگوں سے بے خبر نہیں۔ ایسے کچھ کے پیسے میں گنہ سے ڈرے عزت تاب لوگوں کو بھی خلوط لکھ کر معالی مانگی پڑتی ہے غنیمتوں کو معاف کرنا ان کے لئے مشکل نہیں۔ مگر قوم اور دین کے دشمنوں کو معاف کر دینا ان کی لغت میں حرام ہے۔ قادیانی، کیمونسٹ، مہم کاری برہمنہ والے سے ٹوٹ لے کر پلنے والے دانشور، عوام کی سلامہ لوگوں سے فائدہ اٹھانے والے ہاتھی اور مذہبی رہنما ان کے خاص ہدف ہیں۔ کیمونسٹوں کو وہ تادیب کی طرح ملک و ملت کے لئے کم خطرہ نہیں سمجھتے ان کے نزدیک کیمونسٹوں کا یہ کہنا کہ وہ خدا کے سر نہیں یا مذہب کو قیون نہیں سمجھتے یا مسلمانوں میں

عقیدہ شامل ہیں ایک سلیڈ جھوٹ ہے کیونٹ وہی ہو سکتا ہے جو ٹریٹ
ہو اور میٹر ٹریٹ وہی ہو سکتا ہے جو ہرے ہو سکتی کے بجائے ایک سلیڈ
فلک میں بیٹ کر مسلمانوں کی جیبوں سے گھوا میں پاکر اسٹامپیاں کی جائے
موسیقی کو قابل نصاب کر کے، اسلام اور مسلمانوں کا متناشد دیکھنے کی فکر
میں ہیں۔

ع پر نشان روزگار اسفند مقرر ہو
ثقافت کا کلہاڑا لے کر پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں
ایوبی روہ میں پیدا ہونے والے دانشور بھی پاکستان کے مسلمانوں کے لئے
خطرہ ہیں۔ انہوں نے ذہنی افلاس پیدا کیا ہے ان میں کوئی بدو الکلام
نہیں کوئی محمد علی جتوئی نہیں کوئی ظفر علی خاں نہیں اور کوئی انجیل نہیں یہ لوگ
آغا صاحب کے نزدیک بائیس زیادہ کر کے ہیں۔ حق تو باطل کے سمندر کے
میں غیر جانبدار رہتے ہیں زمین پر اتنا یافتہ فیض صاحب حالت فریاش
مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوبہ مانگ

واگوں گئے تو باطل کے ہمنوا ہو جاتے ہیں ٹکٹے کم ہیں یا پھر ٹکٹے ہی نہیں۔
لیکن آرٹ جو اقبال کے نزدیک ایک مقدس جھوٹ ہے اس کے سرکوت
ہوتے ہیں۔

یہ سوچ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ آغا صاحب آج ہم میں موجود ہیں اللہ ہم ان
سے حکومتی سطح پر کوئی قومی کام نہیں لے رہے کل جب وہ اٹھ ہائیں گے، تو
ان کی یاد میں چند تعزیتی جلسے منعقد کر کے ان کو ممبر ہس کے روحانی وعدوں کی

طرح بھول جائیں گے۔

المختصر طور پر شش کا شمیری ایک ایسی قوم کے فرد ہیں جو زندگی کی قدر نہیں کرتی مگر مردوں پر چڑھا دے چڑھائی ہے جو صاحب اقتدار کو چکا، وہ کتنا مخلص کیوں نہ ہو اور رنگ پرگی کا پھول سے لائق ہے اور محروم اقتدار کو عذار کا لقب دیتی ہے جو بقول امیر خسروؒ ”مٹھ سے رائے کے آگے آگے اور ملت والے کے پیچھے پیچھے چلتی ہے“ اور دیکھیں الاحوال مولانا حسرت موہانیؒ کے الفاظ میں صفت سزا دینا جانتی ہے :- ۵۔
یہ لوگ بھی اٹھ جائیں گے اس درم دلائے
تم دھو نہ لے سکو گے مگر پاؤں سکو گے

سر قاسم، مناسب جہانت یعنی مولانا رشید اختر ندوی
یا مجید لاہوری کی طرح ہلکے پھلکے نہ استاد محترم سید وقار عظیم کی مانند
ٹھہری بھر کم کشادہ پیشانی، باریک ابرو، بولتی اور مسکراتی ہوتی حسین
آنکھیں۔ سنو! ناک، گلابی ہونٹ، گول چہرہ، سرخ و سفید رنگت، علم
حبیب کی گھڑی، خطابت ہاتھ کی چھڑی بروایت عوام الناس، نشر میں
ابوالکلام ثانی، نظم میں ظفر علی خانؒ کے ہم مرتبہ، خطابت میں امیر خسروؒ
کے جانشین بھافت میں حمید نظامی کی یادگار۔ توحید کے پرستار ختم نبوت کے
جاثقار اور غور غلط لوگوں کیلئے شیخ ذوالفقار اٹھے اوطافان، گرے تو بجلی، پکے تو
شعلہ، زنسے تو شبنم، چٹنے تو خنجر، ہلکے تو بھول، چلے تو بیل، بے تو صبا ہے تو
ایکادہ دوستوں کیلئے نیم صبح گاہی، دشمنوں کیلئے قہر اسی، مظلوموں کیلئے آواز، ظالموں

کے لئے نالہ نار ساسہ
جس سے جسگر لالہ میں ٹنڈک ہو وہ شبنم،
وہ یاد دل کے دل جس سے دہلی جاتیں طوفاں
اور یہ ہیں بقول پطرس مرحوم شبنم طبیعت رکھنے والے بارودی انسان۔
حضرت خورش کا شیری

دل کی بات

محترم پروفیسر عاقبی کرنا لی اور برادر م شیخ حبیب الرحمن بٹالوی کا دل
سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود اس
کتاب پر ناقذانہ نظر ڈالی اور اسے زباں و بیاں کی افلاطون سے پاک کیا۔
کتاب کا سرورق مشہور آرٹسٹ شکیل احمد شاہد کے حسن تخیل کا نتیجہ ہے۔
جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

آغا شورش اور احسان دانش کے خوان ادب کے خوشہ میں حبیب صاحب
کو خاکوں کے انبار تلے دبا ہوا دیکھتا ہوں تو رونما آتا ہے۔ ایک شخص ہاسٹر
آف آرٹس کی چار ڈگریاں رکھنے کے باوجود ایسے خوش قسمت انسانوں کے
ما تحت دھکتے کھانے پر مجبور ہے جن کے پاس میٹرک کی سند بھی موجود
نہیں یا جن کے مبلغ علم کا یہ حال ہے کہ قومی زباں پر چار سطریں بھی درست
طور پر نہیں لکھ سکتے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان خوش قسمت انسانوں کی ہر دور
کے ملائکہ المقربین سے یاری رہی۔ حافظ اپنے دور میں چھینا پلاتا رہا ہے

اسپ تازی شدہ مجرورج بریز پالال

طوق تدریس ہمسہ در گردن خرمی نیم

عبید زکافی جسے نابغہ شخص نے حسین پرستے میں اہل علم و ہنر کو مشورہ دیا ہے

رُومِ مِخْرِگی پِیشہ کُن دہزلِ بیا موز

تا د اودِ خود اذِ مہتر و گہتر بستانی

اسیہ سلسلہ ہمارے دور تک پہنچا ہے

اربابِ جہالت کے لئے رُغِ مُسَلَّم

فکار کے حصے میں فقط نانِ جو ہے

ہمارے ملک میں علم کی ناقدری اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ لارڈ میکالے کا یہ سامراجی تعلیمی نظام یکسر بدلی نہیں دیا جاتا اور یہ کام نامہ قیماں اور پکی روٹی کے حامل لوگوں سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی بے دین دانشوروں کے ہاتھوں سرانجام پا سکتا ہے جنہیں اقبال نے داغِ وحشت کا لقب دیا ہے۔ جدید و قدیم علوم سے بہرہ مند اپنے خاندانِ ارمائی پر نازاں جید علمائے کرام پر مشتمل ایک نصابِ تعلیمی بنادی جائے جس کی نگرانی براہِ راست قائدِ عوام فرمائیں۔

جنوبِ بھٹو کے سیاسی کارنامے سستیا دان جانیں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ انہوں نے نوے سالہ قادیانی مسئلہ کو جس قدر براست اور خوش اسلوبی سے حل کیا ہے اس پر پوری مسلمان قوم ہی نہیں بلکہ بقول شورشِ کش کاخمیری اسلامِ ان کا فکر گزار ہے حتیٰ کہ وہ انفقار علی بھٹو کے نام قطعی بغض رکھنے والوں نے بھی قادیانی سو منات کی انیٹ سے انیٹ بجاتے پر ان کے غمِ و فرست کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اس فیصلہ کو عظیم، تسلی بخش اور قابلِ فخر قرار دیا ہے۔ حسن یہ ہے جس کا اعتراف سوکنوں کو بھی ہو۔ قائدِ عوام کے اس عظیم

۱۵۱

فیصلے کو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس سلعاری
نظام تعلیم کو بھی ہل سکتے ہیں جس کے بارے میں ابوالکلام آزاد نے کہا تھا
سے یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
الموسس کہ فرعون کو کالچ کی زبونی

عبدالعزیز
۳۵ ابراہیم روڈ - ملتان

جراتِ زندانہ — از قلم زندان با مصافحہ کی پانی تھی۔ ارشد قلمانی

مؤرخ صاحب کے قلمی خاکے کو عزیزانِ محترم مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دورِ حاضر میں آغا شورش صاحب کو کروڑوں نگاری اور چہرہ کشانی میں اگرچہ بیطلانی حاصل ہے لیکن عزیز صاحب کی شخصیت نگاری کا کچھ ایسا اثر میرے دل پر ہوا کہ دیکھے اور نہ ہونے لوگوں کو بار و گرد دیکھنے اور سننے کی خواہش دل میں چکیاں لینے لگی۔ اسلئے ایک مخلص جوان حبیب بٹالوی کے لہر پر جی چاہا کہ عزیز صاحب کو عزیزانِ محترم کی قلمی کوشش و کاوش پر روشنی پیش کر کے ادیبوں کا ہم بزم ہونے کا شرف حاصل کر لوں۔ — ورنہ من آئم کہ من دو ائم — (دو کی پانی تھی) بلوچ صاحب نے جن شخصیتوں کے خاکے تحریر کئے ہیں ممکن ہے غور و نظر کے بعض زاویوں کو ان کے نظریاتی تشخص سے اختلاف ہو یا غور و مصنف کے بے باکانہ اظہار سے انہیں اختلاف کی گنجائش محسوس ہو لیکن ایک بات کے بارے میں یقیناً اتفاق پایا جائیگا اور وہ ہے صاحبِ کتاب کی محبت اور عقیدت! ظاہر ہے محبت اور عقیدت کی وسعتیں محدود قیود کی پابند نہیں ہوا کرتیں لہذا مصنف اگر کہیں اظہار راستے میں ذرا آگے بڑھ گئے ہیں تو میں ان کی مخلصانہ مجبوری کا نام دوں گا۔

بلوچ صاحب نے تمام خاکے یقیناً محنت سے قلمبند کئے ہیں۔ لیکن جوہرِ اولین اس کتاب کا سب سے زیادہ جاندار حصہ ہے اور مصنف کی ادبی بصیرت کا شاہد بھی۔

ارشد قلمانی

مجلس الشورى

[illegible]

پورٹنامہ - (تقریباً)

[illegible]

[Handwritten signature]

[illegible]

سخن گسترانہ بات !

از قلم :- شمس ملک

سابق ریڈیڈنٹ ایڈیٹر کوہستان
چیف ایڈیٹر ہفت روزہ "اذان"، ملتان

عبدالعزیز بلوچ کی تصنیف "عزیزان محترم"، روزمرہ زندگی کی بعض گونا گوں شخصیتوں کے قلمی چہروں کا ایک دل آویز مجموعہ ہے نوجوان مصنف نے ہمارے گرد و بیش کے معروف لوگوں کے علاوہ کم عام مگر دلچسپ کرداروں کو بھی خاصہ فرسائی کا موضوع بنایا ہے اور اپنے فن کارانہ خلوص و انہماک سے ان کے خاکوں میں ایسا دل فریب رنگ بھرا ہے کہ اول سے آخر تک دلچسپی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ان کے کردار ہماری آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں ہمیں ان سے ایک گونہ یگانگت محسوس ہوتی ہے۔

بلوچ صاحب کی اگرچہ یہ پہلی قلمی کاوش ہے لیکن اس کے باوجود وہ سو وارد معلوم نہیں ہوتے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ خاکہ نویسی فن میں بہت کہنہ مشق اور اس کے داؤ گھات سے پوری طرح آشنا ان کے اسلوب میں ایک انفرادیت تازگی، شگفتگی، ندرت اور بھلا بلاغ ہے اور ان کی یہ خصوصیات خاکہ نویسی کے فن میں بلاشبہ ان روشن مستقبل کی غمازی کرتی ہیں۔ بہر حال

مشک آن باشد.....

لیجئے کتاب حاضر